نظمِ صبحِ چمن

برائے انٹرمیڈیٹ

مؤلّف

پروفیسر شکیل الرحمٰن (بی-اے (آنرز) ایم-اے گولڈ میڈلسٹ)

شعبۂ اردو جموں و کشمیر یونیورسٹی سرینگر

پبلشر

...درس حبہ کدل سرینگر کشمیر

نظم صبحِ چمن

برائے انٹرمیڈیٹ

مؤلف

پروفیسر شکیل الرحمٰن بی۔اے (آنرز) ایم۔اے (گولڈ میڈلسٹ)
شعبۂ اردو جموں و کشمیر یونیورسٹی سری نگر کشمیر

پبلشر

کپور برادرس حبہ کدل سرینگر کشمیر

(خواجہ پریس دہلی)

نام طالب علم ... ...

کلاس ... ...

رول نمبر ... ...

سیکشن ... ...

قیمت:۔ دو روپے پچاس نئے پیسے

ترتیب

۱	حرف اول	۵
۲	مرزا محمد رفیع سودا	۷
۳	خواجہ میر درد	۱۲
۴	میر حسن	۱۶
۵	میر تقی میر	۱۹
۶	سید انشاء اللہ خاں انشاء	۲۴
۷	نظیر اکبر آبادی	۲۷
۸	شیخ امام بخش ناسخ	۳۰
۹	خواجہ حیدر علی آتش	۳۳
۱۰	حکیم مومن خاں مومن	۳۶
۱۱	شیخ محمد ابراہیم ذوق	۴۱
۱۲	اسد اللہ خاں غالب	۴۵
۱۳	دیا شنکر نسیم	۵۴
۱۴	مرزا سلامت علی دبیر	۵۷
۱۵	میر ببر علی انیس	۶۱
۱۶	امیر احمد امیر مینائی	۷۵
۱۷	نواب مرزا خاں داغ	۷۰
۱۸	علی محمد شاد عظیم آبادی	۷۵
۱۹	خواجہ الطاف حسین حالی	۷۸
۲۰	سید اکبر حسین رضوی اکبر الہ آبادی	۸۴
۲۱	برج نراین چکبست	۹۱
۲۲	ڈاکٹر محمد اقبال	۹۹
۲۳	شوکت علی خاں فانی بدایونی	۱۰۷
۲۴	ریاض خیر آبادی	۱۱۱
۲۵	اصغر حسین اصغر گونڈوی	۱۱۳
۲۶	فضل الحسن حسرت موہانی	۱۱۶
۲۷	علی سکندر جگر مراد آبادی	۱۱۹
۲۸	شبیر حسین خاں جوش ملیح آبادی	۱۲۲
۲۹	رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری	۱۲۷
۳۰	روشن صدیقی	۱۳۰
۳۱	علامہ جمیل مظہری	۱۳۲
۳۲	فیض احمد فیض	۱۳۵
۳۳	اسرار الحق مجاز	۱۳۸
۳۴	معین احسن جذبی	۱۴۲
۳۵	کیفی اعظمی	۱۴۵
۳۶	سردار جعفری	۱۴۷
۳۷	ساحر لدھیانوی	۱۵۱
۳۸	احمد ندیم قاسمی	۱۵۳
۳۹	رباعیات محروم	۱۵۵
۴۰	قطعات - اختر انصاری	۱۵۷
	سوالات	۱۵۹

مرزا محمد رفیع نام اور سوداؔ تخلص سنہ ۱۷۱۳ء (سنہ ۱۱۲۵ھ) میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ والد کا نام مرزا محمد شفیع تھا جو تجارت کے لئے ہندوستان آئے تھے۔ سوداؔ نے دہلی میں تعلیم حاصل کی۔ کہا جاتا ہے چونکہ آپ کے والد تجارت کے لئے ہندوستان آئے تھے اس لئے اس رعایت سے انہوں نے تخلص سوداؔ رکھا۔ سوداؔ کو شعر و سخن کا شوق بچپن سے تھا۔ شاہ عالم آپ کے شاگردوں میں تھے ابتدا میں فارسی میں شعر کہتے تھے لیکن بعد ازاں اردو کی طرف راغب ہوئے۔ شاہ عالم کی زندگی میں انہوں نے کافی شہرت حاصل کی تھی۔ طبیعت بہت خوددار تھی ایک بار کسی بات پر شاہ عالم سے ناراض ہو گئے اور پھر کبھی نہ گئے۔ آپ کی شہرت لکھنو تک پھیل گئی۔ نواب شجاع الدولہ نے لکھنو بلایا لیکن دہلی کی مٹی کی محبت سے مجبور تھے۔ لہذا لکھنو جانے سے انکار کر دیا اور یہ رباعی لکھ کر بھیجدی۔

سوداؔ پئے دنیا تو بہر سو کب تک
آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نا کہ دنیا ہووے
بالفرض ہوا یوں بھی پھر تو کب تک

طبیعت میں خودداری اور قناعت پسندی تھی۔ کچھ عرصہ بعد جب حالات بدلے ماحول میں تبدیلیاں آئیں اور دہلی میں قدر دانوں کا فقدان ہوا تو ۶۵ برس کی عمر میں دہلی سے فرخ آباد آئے اور نواب بنگش کے یہاں قیام کیا پھر فیض آباد گئے۔ نواب شجاع الدولہ نے مرزا سوداؔ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد نواب آصف الدولہ نے چھ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر

کر دیا۔

۱۷۸۱ء میں لکھنو میں انتقال ہوا۔ شاہ عالم نے کہا "پہلوان سخن مر گیا" مصحفی نے تاریخ کہی "سودا کجا و آں سخن دلفریب او۔"

سودا اردو زبان کے مسلم الثبوت اُستاد تھے۔ زبان پر قدرت حاصل تھی۔ غزل میں عاشقانہ مضامین ہیں۔ سادگی اور نفاست بھی موجود ہے۔ انہوں نے نئی تشبیہوں و نئے استعاروں کو استعمال کیا ہے۔ اردو قصیدہ کو بلندی پر پہنچا دیا۔ تخیل کی بلندی۔ مضمون آفرینی اور الفاظ کی شان و شوکت۔ قصیدوں میں ہر جگہ موجود ہے۔ قصیدوں میں تاریخی واقعات بھی ہیں۔ ان کی تخلیقات میں غزلیات قصائد۔ رباعیات۔ مسدس۔ مراثی۔ مثنوی۔ سلام۔ مستزاد۔ قطعات۔ مخمس سب کچھ ہیں۔

نمبر ۱

سودا کی مرے جس کو تدبیر نظر آئی
شمشیر کے جوہر کی زنجیر نظر آئی
مقتل پہ مرے آکر انصاف لگا کہنے
تقصیر سے یاں آکے تعزیر نظر آئی
نامہ کا جواب اپنے آتے نہ کبھو دیکھا
قاصد ہی کی گلیوں میں تشہیر نظر آئی
کرتے ہو مداوا کب بیمارِ غم اپنے کا
جب کام ہوا آخر تدبیر نظر آئی

ہے گردش چشم اس کی حلقہ در محشر کا
موج خط پیشانی زنجیر نظر آئی
اس باغ میں اک گُل کو خنداں جو کہیں دیکھا
سو غنچہ کی واں صورت دلگیر نظر آئی
دیکھی نہ بنا ہم نے قیصر و فریدوں کی
جو اپنے خرابہ کی تعمیر نظر آئی
صنعت کے مصور نے کھولا جو مرقع کو
اک اس میں نہ تیری سی تصویر نظر آئی
اس زلف کو جب دیکھا میں ہاتھ میں سوداؔ کے
بکھرے ہوئے ہاتھی کی زنجیر نظر آئی

نمبر ۲

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی
کیا ضد ہے مرے ساتھ خدا جانے وگرنہ
کافی ہے تسلی کو مرے ایک نظر بھی
اے ابر قسم ہے تجھے رونے کی ہمارے
تجھ چشم سے ٹپکا ہے کبھو لختِ جگر بھی
کس ہستیٔ موہوم پہ نازاں ہے تو اے یار
کچھ اپنے شب و روز کی ہے تجھ کو خبر بھی
سوداؔ تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

نمبر ۳

گدا دست اہل کرم دیکھتے ہیں ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں
نہ دیکھا جو کچھ جام میں جم نے اپنے سو اک قطرۂ مے میں ہم دیکھتے ہیں
یہ رنجش میں ہم کو ہے بے اختیاری تجھے تیری کھا کر قسم دیکھتے ہیں
غرض کفر سے ہے نہ کچھ دیں سے مطلب تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں
حباب لب جو ہیں اے باغباں ہم چمن کو ترے کوئی دم دیکھتے ہیں
نوشتے کو میرے مٹاتے ہیں رو رو ملائک جو لوح و قلم دیکھتے ہیں
مٹا جائے ہے حرف حرف آنسوؤں سے جو نامہ اُسے کر رقم دیکھتے ہیں
اگر سے نہیں کام سُنبل کے ہم کو کسی زلف کا پیچ و خم دیکھتے ہیں
خدا دشمنوں کو نہ وہ کچھ دکھاوے جو کچھ دوست اپنے سے ہم دیکھتے ہیں
ستم سے کیا تو نے ہم کو یہ خوگر کرم سے ترے ہم ستم دیکھتے ہیں

مگر تجھ سے رنجیدہ خاطر ہے سودا
اسے تیرے کوچے میں ہم دیکھتے ہیں

نمبر ۴

دل مت ٹپک نظر سے کہ پایا نہ جائے گا
جوں اشک پھر زمیں سے اُٹھایا نہ جائے گا
رخصت دے باغباں! کہ ٹک دیکھ لیں چمن
جاتے ہیں واں جہاں سے پھر آیا نہ جائے گا
کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ
کچھ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا
عمامہ کو اُتار کے پڑھیو نماز شیخ
سجدے سے ورنہ سر کو اُٹھایا نہ جائے گا
دامانِ داغِ تیغ جو دھویا تو کیا ہوا

عالم کے دل سے داغ مٹایا نہ جائے گا

ظالم میں کہہ رہا کہ تو اس خون سے درگذر
سودا کا قتل ہے یہ چھپایا نہ جائے گا

قصیدہ

جاڑے کا موسم

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید — صبح نکلے ہے کانپتا خورشید
جتنا عالم تھا کاشمیر ہوا — بلکہ کہئے کہ زمہریر ہوا
ان دنوں یہ رخ پر نہیں ہے مہر — گود میں کانگڑی رکھے ہے سپہر
کُہر پڑنے کو کہتے ہیں سب یار — ٹھنڈ سے یہ جہاں کے دل میں غبار
لیک دیکھا جو غور کر کے میں آپ — نکلے ہے مُنہ سے آسمان کے بھاپ
دے ہے پوشش زمیں کو پاؤں سے جھاڑ — پا بہ دامن ہیں جس قدر ہیں پہاڑ
پانی پر جس جگہ کہ کائی ہے — سبزہ وہ شال کی رضائی ہے
بس کہ یخ بستہ بحر میں ہے آب — برف کی ہے رکابی ہر گرداب
عکس پانی میں یوں ہے شکل پذیر — رہتی ہے زیر شیشہ جوں تصویر
نہیں ہے نہر باغ میں اس دم — بچّہ بط بھی یخ بچّے سے کم
تیغ سے کاٹتا ہے آب دو چند — آب میں اس قدر ہوئی ہے گزند
اکڑی جاتی ہے دیکھ سنبل کو — گھڑی ہو جائے گل کے غنچہ میں بو
دیکھ گل پر صبا نہیب برد — بھرتی پھرتی ہے ہر طرف دم سرد
گر پڑے ہے برگ تاک سڑ کے تمام — بلبلیں مر رہیں اکڑ کے تمام
صرصر صبح جان کھوتی ہے — تیر سی دل کے پار ہوتی ہے

باد سے برگ کھڑکے ہیں اس بھانت — کہے تو باجتے ہیں دانت سے دانت
جس طرف اب نگاہ جاتی ہے — جوں ہی جوں بید تھرتھراتی ہے
کانپتے ہیں درخت وارض و جبال — موسم دے ہے بارو یا بھونچال
آگ بھی ٹھنڈ سے ٹھٹھرتی ہے — گودوں کے بیچ چھپتی پھرتی ہے
بے حرارت ہیں سردی کے مارے — طرح یاقوت کی اب انگارے

جاڑا لگنے کا یخ نلک ہے حرف — لیٹی رہتی ہے تمدوں ہی میں برف
دن کی کٹتی ہے دھوپ میں اوقات — کالے کمبل میں رات کاٹے ہے رات
رعد سردی کے ہاتھ گرم فروش — ابر دوغی ہوا یہ بالا پوش
برف پڑتی نہیں فلک نداف — پھینکے ہے واسطے زمین کے لحاف
شب جو زخشندگی پہ برق آئے — ابر میں یوں ٹھٹھر کے رہ جائے
گر کسی شخص کو مرض ہے اب — تودہ جاڑے ہی سے کرے ہے تب
فرط سرما سے دیکھئے جس کو — دست زیر بغل ہے مثل سبو
منعموں کے گھر دلہیں آج اور کل — ہیں پڑے پردے ڈھکے ہے منقل
پہنتے ہیں سمور اور قاقم — ٹھنڈ سے کھینچتے بہم سودم
اس پہ جاڑے سے ہے برا ان کا حال — ناک سے چھوٹتا نہیں رومال
جھیکنا جاڑے کا جو چھینکیں ہیں — اک سخن ہے تو لاکھ چھینکیں میں
کوئی اب جاڑے سے مل نہیں سکتا — گھر سے باہر نکل نہیں سکتا
پھر جو کوئی تدان نکلے ہے — ٹھنڈ کے مارے جان نکلے ہے
لپٹے رہتے ہیں روئی میں مجبور — جس طرح ناشپاتی و انگور
اہل حرفہ کو کیجئے جو نگاہ — کاروبار اُن کا ہوگیا ہے تباہ
پیٹ کو سر کہے ہے بھٹیارا — ہائے اب کیا کروں میں بیچارہ
سقا بولے ہی بھر کے آنکھوں میں اشک — یارو پانی نکالو چیر کے مشک

آہ قناد بھر کے یوں بولے
بنی تھی قند ہو گئے اولے

دیکھو حلوائی کو جو بیٹھے کہیں
برفی چھٹ کچھ دکان میں اس کے نہیں

لگے ہے اب جو مرنے لے جاڑا
یہی کہتا ہے ٹھنڈ نے مارا

غرض ایسی ہی کچھ پڑی ہے ٹھنڈ
مٹ گیا زمہریر کا بھی گھمنڈ

سودا آخر ہے سردی کا مذکور
شعر بھی گر خنک ہوں رکھ معذور

آگے جاتا نہیں ہے اب بولا
ہو گئی ہے زبان بھی اولا

خواجہ میر نام اور دردؔ تخلص۔ ۱۷۰۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام خواجہ محمد ناصر تھا۔ خواجہ صاحب فارسی کے اچھے شاعر تھے

سلسلہ پیری و مریدی کی وجہ سے آپ کا خاندان کافی عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا پندرہ برس کی عمر میں رسالہ احکام الصلواۃ لکھا۔ اس کے علاوہ تصوف پر اور بھی کتابیں لکھیں۔ دہلی کی بربادی پر بھی میر دردؔ نے دہلی نہیں چھوڑا۔ طبیعت میں خودداری اتنی تھی کہ کبھی کسی کی شان میں قصیدہ نہیں لکھا۔ آپ کا انتقال مطابق ۱۱۹۹ھ میں ہوا۔ کسی شاگرد نے تاریخ کہی۔ "حیف دنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب"

ایک شاعر کی حیثیت سے خواجہ میر دردؔ کا مرتبہ بہت بلند ہے آپ کی شاعری میں تصوف اور معرفت کا رنگ گہرا ہے۔ سنجیدگی ہر جگہ چھائی ہوئی ہے۔ اخلاقی عناصر کی کمی نہیں ہے

مرا جی ہے جب تک تری جستجو ہے
زباں جب تلک ہے یہی گفتگو ہے

خدا جانے کیا ہوگا انجام اس کا
میں بے صبر اتنا ہوں وہ تند خو ہے

تمنا ہے تری اگر ہے تمنا
تیری آرزو ہے اگر آرزو ہے

کیا سیر سب ہم نے یہ گلزار دنیا

گلِ دوستی میں عجب رنگ و بو ہے
غنیمت ہے یہ دید وا دید یاراں
جہاں مند گئی آنکھ میں ہوں نہ تو ہے
نظر میرے دل کی پڑی درد کس پر
جدھر دیکھتا ہوں وہی روبرو ہے

نمبر(۲)

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
جان سے ہو گئے بدن خالی
جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا
ان لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے دیکھا
زور عاشق مزاج ہے کوئی
درد کو قصہ مختصر دیکھا

نمبر(۳)

ہم نے کس رات نالہ سر نہ کیا
پر اسے آہ نے اثر نہ کیا
سب کے ہاں تم ہوئے کرم فرما
اس طرف تو کبھو گذر نہ کیا
کیوں بھنویں تانتے ہو بندہ نواز
سینہ کس وقت میں سپر نہ کیا
کتنے بندوں کو جان سے کھویا
کچھ خدا کا بھی تو نے ڈر نہ کیا

دیکھنے کو رہے ترستے ہم
نہ کیا رحم تونے پر نہ کیا
آپ سے ہم گذر گئے کب کے
کیا ہے ظاہر میں گو سفر نہ کیا
کون سا دل ہے وہ کہ جس میں آہ
خانہ آباد تونے گھر نہ کیا
سب کے جوہر نظر میں آئے درد
بے ہنر تونے کچھ ہنر نہ کیا

نمبر (۴۴)

ہستی ہے جب تک ہم ہیں اسی اضطراب میں
جوں موج آپھنسے ہیں عجب پیچ و تاب میں
نے خانۂ خدا ہے نہ ہے یہ بتوں کا گھر
رہتا ہے کون اس دل خانہ خراب میں
آئینۂ عدم ہی میں ہستی ہے جلوہ گر
ہے موج زن تمام یہ دریا سراب میں
غافل جہاں کی دید کو مفت نظر سمجھ
پھر دیکھنا نہیں ہے اس عالم کو خواب میں
ہر جز کو کل کے ساتھ بمعنی ہے اتصال
دریا سے دُر جدا ہے یہ ہے غرق آب میں
پیری نے ملک تن کو اُجاڑا و گر نہ یاں
تھا بند و بست اور ہی عہد شباب میں
میں اور درد مجھ سے خریداری بتاں
ہے ایک دل بساط میں سو کس حساب میں

نمبر ۵

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

وحدت میں تیری حرف دوئی کا نہ آ سکے
آئینہ کیا مجال تجھے مُنہ دکھا سکے

میں وہ فتادہ ہوں کہ بغیر از فنا مجھے
نقش قدم کی طرح نہ کوئی اُٹھا سکے

قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے
اُس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

غافل! خدا کی یاد یہ مت بھول زینہار
اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے

یارب یہ کیا طلسم ہے اور اک و فہم یاں
دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جا سکے

مست شراب عشق وہ بے خود ہے جس کو حشر
اے دردؔ چاہے لائے بخود پھر نہ لا سکے

میر غلام حسن نام اور حسن تخلص۔ ۱۷۳۶ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ والد کا نام میر غلام حسن ضاحک تھا۔ آبا و اجداد ہرات کے باشندے تھے جب دہلی کا ماحول خراب ہوا اور وہاں کی زندگی لٹ گئی تو میر ضاحک فیض آباد چلے آئے۔ اس وقت میر حسن کی عمر صرف بارہ سال تھی۔ شروع میں اپنے والد سے اصلاح لی پھر سودا اور میر درد سے استفادہ سخن کیا۔ نواب سرفراز جنگ خلف نواب سالار جنگ کے دربار میں آپ کی کافی عزت تھی۔ ۱۷۸۶ء میں لکھنو میں انتقال ہوا۔ مصحفی نے تاریخ کہی "شاعر شیریں زبان"

میر حسن نے غزلیات۔ قصائد۔ مراثی۔ رباعیات اور مثنویات پر طبع آزمائی کی ہے۔ مثنوی "بدر منیر" لکھ کر آپ نے کافی شہرت حاصل کی۔

مثنوی میں زبان نہایت ہی فصیح اور با محاورہ ہے۔ زبان کی روانی اور بے ساختگی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ما فوق الفطرت عناصر میں بھی انسانی زندگی کی جھلکیاں موجود ہیں۔ انسانی نفسیات کی باریکیاں بھی کرداروں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ مثنوی سحر البیان ان کے زمانہ کے حالات اور رسم و رواج کی پوری تصویر ہے۔

مثنوی سحر البیان کے علاوہ گلزار ارم اور رموز العارفین میر حسن کی بہترین تخلیقات ہیں۔

پلا آتشین آب پیر مغان
کہاروں کی زربفت کی کرتیاں
بندھیں پگڑیاں تاش کی سر اوپر
وہ ہاتھوں میں سونے کے موٹے کڑے
وہ ماہی مراتب وہ سرور وال
وہ شہنائیوں کی صدا خوش نما
وہ آہستہ گھوڑوں پر نقارچی
بجاتے ہوئے شادیانے تمام
سوار اور پیادہ صغیر و کبیر
وہ نذریں کہ جن جن نے تھیں ٹھاتیاں
ہوئے حکم سے شاہ کے پھر سوار
سجے اور سجائے سبھی خاص و عام
طرف اور طرق، اور پرے کے پرے
مرصع کے سازوں سے کوتل سمند
وہ فیلوں کی اور میگذنبر کی شان
چلے پایہ تخت کے ہو قریب
سواری کے آگے پیئے اہتمام
نقیب اور جلودار اور چوب دار
اسی اپنے معمول و دستور سے
ایلا نوجوانو بڑھے جائیو

کہ بھولے مجھے گرم و سرد جہاں
اور ان کے دلیے پاؤں کی پھرتیاں
چکا چوند میں جس سے آوے نظر
جھلک جس کی ہر ہر قدم پر پڑے
وہ نوبت کہ دولھا کا جیسے سماں
سہانی وہ نوبت کی اس میں صدا
قدم باقدم با لباس زری
چلے آگے آگے ملے شادکام
جلو میں تمامی امیر و وزیر
شہ و شاہزادے کو گزرانیاں
چلے سب قرینے سے باندھے قطار
لباس زری میں ملبس تمام
کچھ ایدھر اُدھر کچھ ورے کچھ پرے
کہ خوبی میں روح القدس سے دوچند
جھلکتے وہ مقیش کے سائبان
بدستور شاہانہ پہنے جریب
لئے سونے روپے کے عاصے تمام
یہ آپس میں کہتے تھے ہر دم پکار
ادب سے تفاوت سے اور دور سے
دو جانب سے بانگیں لئے آئیو

بڑھے جائیں آگے سے چلتے قدم
بڑھے عمر و دولت قدم بہ قدم

غرض اِس طرح سے سواری چلی
کہے تو کہ بادِ بہاری چلی

تماشائیوں کا جُدا تھا ہجوم
کہ ہر طرف تھی لاکھ عالم کی دھوم

لگا قلعے سے شہر کی حد تلک
دو کانوں پہ تھی بادلے کی جھلک

منڈھے تھے تمامی سے دیوار و در
تمامی تھا وہ شہر سونے کا گھر

کیا تھا زبس شہر آئینہ بند
ہوا چوک کا لطف واں چار چند

رعیت کی کثرت ہجوم سپاہ
گزرتی تھی رک رک کے ہر جا نگاہ

ہوئے جمع کوٹھوں پہ جوں مرد و زن
ہر اک سطح تھی جوں زمین چمن

لگا لنج سے تا ضعیف و نحیف
تماشے کو نکلے وضیع و شریف

وحوش و طیور واں تلک بے خلل
پڑے آشیانوں سے اپنے نکل

نہ پہنچا جو اک مرغ قبلہ نما
سو وہ آشیانے میں تڑپا کیا

زبس شاہزادہ بہت تھا حسین
ہوئے دیکھ عاشق کہیں و مہیں

نظر جس کو آیا وہ ماہ تمام
کیا اُس نے جھک جھک کے اسکو سلام

دعا شاہ کو دی کہ یا رب الٰہ
سدا یہ سلامت رہے مہر و ماہ

یہ خوش اپنے مہ سے رہے شہریار
کہ روشن رہے شہر پروردگار

غرض شہر سے باہر اک سمت کو
کوئی باغ تھا شہ کا اس میں سے ہو

گھڑی چار تک خوب سی سیر کر
رعیت کو دکھلا کے اپنا پسر

اسی کثرت فوج سے ہو سوار
پھرا شہر کی طرف وہ شہریار

سواری کو پہنچا گئی فوج ادھر
گئے اپنی منزل میں شمس و قمر

جہاں تک کہ تھیں خادمان محل
خوشی سے وہ ڈیوڑھی تک آئیں نکل

قدم اپنے حجروں سے باہر نکال
کیا سب نے آ پیشوا حال حال

بلائیں لگیں لینے سب ایک بار
کیا جی کو یک دست سب نے نثار

گیا جب محل میں وہ سرو رواں
بندھا ناچ اور راگ کا واں سماں

پہر رات تک پہنے پوشاک وہ
رہا ساتھ سب کے طرب ناک وہ

میر تقی نام اور میر تخلص۔ ۱۷۲۴ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میر محمد علی تھا۔ والد کے انتقال کے بعد میر دہلی چلے آئے۔ دہلی میں اپنے ماموں سراج الدین خان آرزو کے ہاں پرورش پائی۔ ابتدائی تعلیم میر جعفر عظیم آبادی سے حاصل کی۔ سراج الدین خان آرزو نے میر کی غزلوں پر اصلاح کی۔ خان آرزو کی صحبت ہی کا نتیجہ تھا کہ میر میں شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کی شاعری کی دھوم مچ گئی کہا جاتا ہے کہ میر کی غزلیں مسافر ایک جگہ سے دوسری جگہ بطور تحفہ لے جاتے تھے۔ نواب صمصام الدولہ نے میر کی کافی قدر کی لیکن وہ انتشار کا زمانہ تھا۔ میر اپنی مفلسی کی وجہ سے دہلی میں رہے لیکن پھر حالات سے مجبور ہوکر لکھنو چلے گئے۔ نواب آصف الدولہ نے تین سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کیا لیکن میر کی طبیعت نازک تھی اس لئے ایک روز ناراض ہو گئے اور دربار میں جانا پسند نہ کیا۔ زندگی کے آخری ایام مصیبت میں بسر ہوئے ۱۸۱۰ء میں لکھنو میں انتقال کیا۔ ناسخ نے تاریخ کہی ؎

"واویلا مرد شہ شاعراں"

میر کی شاعری میں ان کی زندگی کی تصویریں جھلکتی ہیں۔ زندگی کی حسرت اور زندگی کا غم سعا ... شاعری

میں موجود ہے۔ زبان سادہ ہے۔ مثنوی کے فن میں بھی کامیابی حاصل کی ؂

میر تقی میر

(۱)

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا
میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں
جسے ابر ہر سال روتا رہے گا
مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا
مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے
جرس کا جو بھی جوش کھوتا رہے گا
بس اے میر مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

نمبر (۲)

اے دوست کوئی مجھ سا رسوا نہ ہوا ہوگا
دشمن کے بھی پر ایسا نہ ہوا ہوگا

اس کہنہ خرابی میں آبادی نہ کر منعم
اک شہر نہیں یاں جو صحرا نہ ہوا ہوگا
آنکھوں سے تری ہم کو ہے چشم کہ اب ہووے
جو فتنہ کہ دنیا میں برپا نہ ہوا ہوگا

جز مرتبہ کل کو حاصل کرے ہے آخر
یک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہوگا

نمبر (۳)

رنگ اُڑ چلا چمن میں گلوں کا تو کیا نسیم
ہم کو تو روزگار نے بے بال و پر کیا
نافع جو تھیں مزاج کو اول سو عشق میں
آخر اُنھی دواؤں نے ہم کو ضرر کیا
کیا جانوں بزم عیش کہ ساقی کی چشم دیکھ
میں صحبت شراب سے آگے سفر کیا
جس دم کہ تیغ عشق کھنچی بوالہوس کہاں
سُن لیجئے کہ ہم ہی نے سینہ سپر کیا
وہ دشت خوف ناک رہا ہے مرا وطن
سُن کر جسے خضر نے سفر سے حذر کیا

نمبر (۴)

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لوہو آتا ہے جب نہیں آتا
ہوش جاتا رہا نہیں لیکن
جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا
صبر تھا ایک مونس ہجراں
سو وہ مدّت سے اب نہیں آتا
دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش
گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا
عشق کو حوصلہ ہے شرط ورنہ

بات کا کس کو ڈھب نہیں آتا

جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم
پر سخن تا بہ لب نہیں آتا

نمبر (۵)

دیر و حرم سے گزرے اب دل ہے گھر ہمارا
ہے ختم اس آبلے پر سیر و سفر ہمارا

دنیا و دیں کی جانب میلان ہو تو کیسے
کیا جانیے کہ اُس بن دل ہے کدھر ہمارا

جوں صبح اب کہاں ہے طول سخن سے فرصت
قصّہ ہی کوئی دم پہ ہے منحصر ہمارا

کوچے میں اس کے جا کے تنہا نہیں پھر آنا
خوں ایک دن گرے گا اس خاک پر ہمارا

نمبر (۶)

غم رہا جب تک کہ دم رہا
دل کے جانے کا نہایت غم رہا

حسن تھا تیرا بہت عالم فریب
خط کے آنے پر بھی اک عالم رہا

جامۂ احرام زاہد پر نہ جا
تھا حرم میں لیک نا محرم رہا

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدّت تک وہ کاغذ نم رہا

صبح پیری شام ہونے آئی میرؔ
تو نہ چیتا یاں بہت دن کم رہا

نمبر (۷)

کرو توکّل کہ عاشقی میں نہ یوں کروگے تو کیا کروگے
الم جو یہ ہے تو دردمندو کہاں تلک تم دوا کروگے
جگر میں طاقت کہاں ہے اتنی کہ دردِ ہجراں سے مرتے رہتے
ہزاروں وعدے وصال کے تھے کوئی بھی جیتے وفا کروگے
اخیر الفت یہی نہیں ہے کہ جل کے آخر ہوئے پتنگے
ہوا جو یاں کی یہ ہے تو یارو غبار ہو کر اڑا کروگے
علم میں ہم کو یہ غم رہے گا کہ اور دل پہ اب ستم رہے گا
تمہیں تو لت ہے ستانے ہی کو کسو پہ آخر خفا کروگے
اگرچہ اب تو خفا ہو لیکن ہوئے گئے پر کبھو ہمارے
جو یاد ہم کو کروگے پیارے تو ہاتھ اپنے ملا کروگے
سحر کو محرابِ تیغ قاتل کبھو جو یارو ادھر ہو مائل
تو ایک سجدہ بسانِ بسمل مری طرف سے ادا کروگے
غمِ محبت سے میر صاحب بہ تنگ ہوں میں فقیر ہو تم
جو وقت ہوگا کبھی مساعد تو میرے حق میں دعا کروگے

سید انشاء اللہ خان انشاء

سید انشاء اللہ خان نام اور انشاء تخلص والد کا نام میر ماشاء اللہ خان تھا۔ آپ کے بزرگ شاہی امراء میں شمار کیے جاتے تھے۔ آپ کے والد کو شاعری سے کافی لگاؤ تھا وہ مصدر تخلص کرتے تھے۔ سید انشاء نے شروع میں اپنے والد ہی سے اصلاح لی۔ دلّی کی تباہی کے بعد انشاء لکھنو چلے گئے۔ شروع میں شہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کے یہاں ملازمت کی اور پھر نواب سعادت علی خان نواب اودھ کے یہاں آ گئے۔ انشاء ظریف اور بذلہ سنج تھے۔ یہی وجہ ہوئی کہ نواب صاحب ان سے جلد اُکتا گئے۔ انشاء کا آخری زمانہ پریشانیوں میں گذرا ۱۸۱۷ء میں انتقال ہوا۔

سید انشاء نے اردو میں سب سے پہلے صرف و نحو پر کتاب لکھی۔ مختلف رنگ کی چیزیں ان کے یہاں ملتی ہیں۔ طرز بیان انوکھا ہے۔ آپ کی غزلوں میں خیالات کم ہیں اور الفاظ کی شان و شوکت زیادہ۔

نمبر (۱)

جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا
لگا کے برف میں ساقی صراحی مے لا
قدم کو ہاتھ لگاتا ہوں اُٹھ کہیں گھر چل
خدا کے واسطے اتنے تو پاؤں مت پھیلا

نکل کے وادیٔ وحشت سے دیکھ اے مجنون
کہ روز دھوم سے آتا ہے ناقہ لیلا
گرا جو ہاتھ سے فرہاد کے کہیں تیشہ
درون کوہ سے نکلی صدائے واویلا
نزاکت اس گل رعنا کی دیکھیو انشاء
نسیم صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

نمبر (۲)

مجھے کیوں نہ آوے ساقی نظر آفتاب الٹا
کہ پڑا ہے آج خم میں قدح شراب الٹا
عجب الٹے ملک کے ہیں اجی آپ بھی کہ تم سے
کبھی بات کی جو سیدھی تو ملا جواب الٹا
چلے تھے حرم کو رہ میں ہوئے اک صنم کے عاشق
نہ ہوا ثواب حاصل یہ ملا عذاب الٹا
یہ شب گذشتہ دیکھا وہ خفا سے کچھ ہیں گویا
کہیں حق کرے کہ ہووے یہ ہمارا خواب الٹا
ہوئے وعدہ پر جو جھوٹے تو نہیں ملاتے تیور
اے لو دیکھو یہ تماشہ یہ سنو عتاب الٹا
کھڑے چپ ہو دیکھتے کیا مرے دل اجڑ گئے کو
وہ گہنہ تو کہدو جس سے یہ ہوا خراب الٹا
غزل اور قافیوں میں نہ کہے تو کیونکر انشاء
کہ ہوا نے خود بخود آ ورق کتاب الٹا

نمبر (۳)

خیال کیجئے کیا آج کام میں نے کیا

جب اُس نے دی مجھے گالی سلام میں نے کیا

کہا یہ صبر نے دل سے کہ لو خدا حافظ
کہ حق بندگی اپنا تمام میں نے کیا

جنوں یہ آپ کی دولت ہوا نصیب مجھے
کہ ننگ و نام کو چھوڑا یہ نام میں نے کیا

جھڑک کے کہنے لگے لگ چلے بہت اب تم
کبھی جو بھول کے ان سے کلام میں نے کیا

تمہارے واسطے تم اپنے دل میں غور کرو
کبھی کسی سے نہ ہو جو مدام میں نے کیا

مزا یہ دیکھئے گا شیخ جی رکے اُلٹے
جو ان کی بزم کا کل احترام میں نے کیا

ہوس یہ رہ گئی صاحب اُنے پر کبھی نہ کہا
کہ آج سے تجھے انشاء غلام میں نے کیا

ولی محمد نظیر اکبرآبادی

ولی محمد نام اور نظیر تخلص۔ وطن دہلی تھا۔ دہلی کی تباہی کے بعد نظیر اکبر آباد چلے آئے۔ آپ کا کوئی اُستاد نہ تھا۔ شاہ اودھ نے معقول تنخواہ پر اپنے ہاں بلایا لیکن نہیں گئے۔ ۱۸۳۰ء میں آگرہ میں انتقال کیا۔

ان کے قبل کسی نے بھی اس رنگ میں شاعری نہیں کی تھی۔ خیالات اور زبان دونوں میں نیا رنگ ہے ان کی شاعری میں عوامی زبان کا استعمال ہے۔ ہندوستان کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے انہوں نے اپنے وطن کی خاص چیزوں کو اپنا موضوع بنایا۔ ہندوستان کے تہواروں اور میلوں پر بہت ساری نظمیں لکھی ہیں وہ ایک عوامی شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں روزمرہ کے محاورے ہر جگہ نظر آتے ہیں۔

آدمی نامہ

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی ہے   اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی ہے   نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ٹکڑے سے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ابدال و قطب و غوث و ولی آدمی ہوئے   منکر بھی آدمی ہوئے اور کفر کے بھرے

کیا کیا کرشمے کشف و کرامات کے لئے   حتیٰ کہ اپنے زہد و ریاضت کے زور سے

خالق سے جا ملا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور — یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حسن و قبیح میں یہاں ظہور — شیطاں بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زور
اور ہادی رہ نما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں — بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
قرآن آدمی ہی پڑھیں اور نمازیاں — اور آدمی ہی اُن کی چُراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی — اور آدمی کو تیغ سے مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اتارے ہے آدمی — چلا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مرتے ہیں آدمی ہی کفن کرتے ہیں تیار — نہلا دھلا اُٹھاتے ہیں کاندھے پہ کر سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں روتے ہیں زار زار — سب آدمی ہی کرتے ہیں مردے کا کاروبار
اور وہ جو مر گیا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر — ہیں آدمی ہی صاحب عزت بھی اور حقیر
یاں آدمی مرید ہے اور آدمی ہی پیر — اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر
اور سب میں جو بُرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

دیوانہ پن

وہ رشکِ چمن گل جو زیبِ چمن تھا
چمن جنبشِ شاخ سے سینہ زن تھا

گیا میں جو اس بن چمن میں تو ہر گل
مجھے اس گھڑی اخگرِ پیرہن تھا

یہ غنچہ جو بے درد گلچیں نے توڑا
خدا جانے کس کا یہ نقشِ دہن تھا

تنِ مردہ کو کیا تکلّف سے رکھتا
گیا وہ تو جس سے مزیّن یہ تن تھا

کئی بار ہم نے دیکھا کہ جن کا
مُشیّن کفن تھا معطر بدن تھا

نظر آ گئے ہم کو ہوس تھی کفن کی
جو سوچا تو ناحق کا دیوانہ پن تھا

شیخ امام بخش نام اور ناسخ تخلص۔ لاہور کے رہنے والے تھے۔ فیض آباد میں تعلیم حاصل کی۔ فارسی زبان سے بھی اچھی واقفیت تھی۔
لکھنو کی ادبی فضا کا گہرا رنگ آپ کی شاعری پر ہے۔ غزلوں میں مبالغہ اور سپاٹ پن ہے۔ الفاظ کی شان و شوکت ہے۔ آپ نے رباعیاں اور تاریخیں بھی لکھی ہیں ۱۸۳۸ء میں انتقال ہوا۔

نمبر (۱)

کافی بس اس کو نشہ ہے بوئے شراب کا
ہو بوجھ جس کے ہاتھ میں ساغر حباب کا
کہتے ہیں تیرے عارض و قامت کو دیکھ کر
بالائے سرو پھول کھلا ہے گلاب کا
ہر صبح وہی صبح ہے ہر شام وہی شام
انسان پر ہے زور فقط انقلاب کا
آتی ہے خشک و تر سے مجھے بوئے زلف یار
ہے مشک کی زمین تو دریا گلاب کا
ان کی نگاہ گرم جو پڑتی ہے غیر پر
ابلیس اب نشانہ ہے تیر شہاب کا
پیری بغیر ہم نے نہ دیکھا طلوع صبح
گزرا شب فراق میں موسم شباب کا
محشر میں ہم کو نامۂ اعمال دیکھ کر
قاصد خیال آئے گا خط کے جواب کا

ارض و سما کے طبقے ہیں بازی گنجنا
چوتھا فلک ہے ایک ورق آفتاب کا

ہم زائران ساقی کو نشہ نہیں واعظا
کشتی ایاغ کی ہو تو دریا شراب کا
راحت طلب کروں تو ملے آسماں سے رنج
حاضر ہو موت ابھی جو خیال آئے خواب کا
گھل گھل کے مر گیا ہوں دریائے عشق میں
کافی ہے میرے دفن کو گنبد حباب کا
صبح فراق میں ہوئی قدر شب وصال
آیا ہے یاد پیری میں عالم شباب کا

نمبر (۲)

عکس اس کی زلف کا نہیں جام شراب میں
بال آتے ہیں نظر قدح آفتاب میں
غواص اپنی فکر ہوئی جب کہ آب میں
دریا اک موج زن نظر آیا حباب میں
آئی قیامت اس نے لگایا ہے منہ سے جام
ہے اتصال ماہ میں اور آفتاب میں
غفلت سے اپنا طالب دیدار آپ ہوں
میرا ہی چہرہ ہے جو نہاں ہے نقاب میں

ساغر میں عکس رُخ گُل گوں پہ ہے عرق
موتی جو آگ میں ہے تو شعلہ ہے آب میں
آرام سے وہی ہے جو پھیرے خدا سے مُنہ
دیکھو ہے مرغ قبلہ نما اضطراب میں

بیدار دل ہیں جو انہیں سونے کا کیا ضرور
یوسف ہوا ستاروں کا مسجود خواب میں
عبرت کے واسطے یہ قدرت نے غافلو
کھینچی شبیہ افسر شاہی حباب میں

نمبر (۳)

دل اک بت پہ شیدا ہوا چاہتا ہے
خدا جانے اب کیا ہوا چاہتا ہے
یہ جوش شراب اس برس ہے کہ ساقی
فلک مثل مینا ہوا چاہتا ہے
بط مئے کو پہنچائے کوئی یہ مژدہ
رواں مئے کا دریا ہوا چاہتا ہے
گذر اس پری کا ہے اکثر چمن میں
درختوں کو سایہ ہوا چاہتا ہے
جنون ضعف اگر یوں ہی زنجیر پا ہے
تو زنداں بھی صحرا ہوا چاہتا ہے

خواجہ حیدر بخش علی نام اور آتش تخلص سنہ ۱۷۶۷ء میں پیدا ہوئے آپ کے والد کا نام خواجہ علی بخش تھا۔ آبا و اجداد دہلی کے رہنے والے تھے۔ کم عمری میں والد کا انتقال ہو گیا اس لئے تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ تھوڑی بہت عربی و فارسی پڑھی۔ وہ زمانہ ناسخ اور مصحفی کی شاعری کے عروج کا زمانہ تھا لکھنؤ میں ان لوگوں کی دھوم تھی آتش نواب محمد تقی کے ساتھ لکھنؤ آئے اور مصحفی سے اصلاح لی۔ دربار لکھنؤ سے آتش کو اسی روپیہ ماہانہ وظیفہ ملا۔ غیور طبع تھے۔ اسی لئے کسی بادشاہ یا نواب کی مدح میں قصیدہ نہ لکھا سنہ ۱۸۴۷ء میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ کسی نے تاریخ کہی "خواجہ حیدر علی اے وا مردند۔"

آتش نے غزل کو عظمت بخشی ہے۔ زبان کی صفائی ہے اور جذبات کی ترجمانی۔ بات کو سیدھے طریقہ سے پیش کر دینے کے قایل تھے۔ نازک خیالی اور تصوّف کا رنگ ہر جگہ موجود ہے۔

نمبر (۱)

تار تار پیرہن میں بس گئی ہے بوئے دوست
مثل تصویر نہالی میں ہوں یا پہلوئے دوست

ہجر کی شب ہو چکی روز قیامت ہے دراز
دوش سے نیچے نہیں اترے ابھی گیسوئے دوست

دور کر دل کی کدورت محو ہو دیدار کا

آئینے کو بس صفائی نے دکھایا روئے دوست
واہ ری شانہ کی قسمت کس کو یہ معلوم تھا
پنجۂ شل سے کھلیں گے عقدہائے موئے دوست
داغ دل پہ خیر گزری تو غنیمت جانیئے
دشمن جاں ہیں جو آنکھیں دیکھتی ہیں سوئے دوست
دو مریں گے زخم کاری سے تو حسرت سے ہزار
چار تلواروں میں شل ہو جائے گا بازوئے دوست
فرش گل بستر تھا اپنا خاک پر سوتے ہیں اب
خشت زیر سر نہیں یا تکیہ تھا زانوئے دوست
یاد کر کے اپنی بربادی کو رو دیتے ہیں ہم
جب اڑاتی ہے ہوائے تند خاک کوئے دوست
اس بلائے جاں سے آتش دیکھیئے کیوں کر بنے
دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبل بے تاب گفتگو کرتے
پیا میسر نہ ہوا تو خواب ہوا
زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے
مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے
ہمیشہ رنگ زمانہ بدلتا رہتا ہے
سفید رنگ میں آخر سیاہ مو کرتے
لٹاتے دولت دنیا کو مے کدے میں ہم

طلائی ساغر مئے نقرئی سبو کرتے

ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا
تمام عمر رفوگر رہے رفو کرتے

جو دیکھتے تری زنجیر زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

بیاض گردنِ جاناں کو صبح کہتے جو ہم
ستارۂ سحری تکمۂ گلو کرتے

یہ کعبہ سے نہیں بے وجہ نسبت رخ یار
یہ بے سبب نہیں مردے کو قبلہ رو کرتے

سکھاتے نالۂ شب گیر کو در اندازی
غم فراق کا اس چرخ کو عدو کرتے

وہ جانِ جاں نہیں آتا تو موت ہی آتی
دل و جگر کو کہاں تک بھلا لہو کرتے

نہ پوچھ عالم برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

نمبر (۳)

داغ غم عشق کو دل میں جگہ دیجئے
ڈھونڈیئے لیکر چراغ شاہد مقصود کو

پردہ غفلت اٹھا پیش نظر یار ہے
دیر و حرم میں نہ جا ڈھونڈنے موجود کو

سجدہ کے انکار سے فوق نہ ہو جائے گا
خاکی مقبول پہ ناز ی مردود کو

صاحب اقبال کو خوب ہے پہچانتا

آنکھ خدا نے ہے دی کو کب مسعود کو

مومن خان نام اور مومن تخلص۔ ۱۸۰۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حکیم غلام نبی تھا حسین شاہ عالم کے زمانہ میں پنجاب کے ایک پرگنہ نوزنول میں جاگیر ملی تھی۔ مومن کے دادا نامدار خان کشمیر سے دہلی تشریف لائے اور شاہی طبیب مقرر ہوئے۔ جو جاگیر ملی وہ غدر کے بعد ضبط ہوگئی۔ حکیم غلام نبی کو مولینا عبدالعزیز سے عقیدت تھی۔ مولینا موصوف نے آپ کا نام مومن خان رکھا تھا۔ مومن نے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ فن طب سے بھی دلچسپی تھی شاعری میں شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے طبیعت بہت نازک تھی۔ عاشق مزاج اور عالی خیال تھے۔ خوددار بہت تھے۔ یہی وجہ ہوئی کہ آپ کا تعلق کبھی کسی دربار سے نہیں رہا۔ راجہ کپورتھلہ نے تین سو روپیہ تنخواہ پر بلایا مگر نہیں گئے ۱۸۵۲ء میں کوٹھے سے گر پڑے اور انتقال کیا۔ علم نجوم کی رو سے حساب لگایا تھا کہ پانچ سال یا پانچ ماہ یا پانچ دن میں مرجاؤں گا" پانچ ماہ میں انتقال کیا۔ تاریخ خود ہی کہی۔

"دست و بازو بشکستیت"

مومن اپنے وقت کے ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ آپ کی غزلوں میں سوز و گداز اور درد ہے۔ خیالات کی نزاکت اور پاکیزگی بھی ہے۔ انسانی جذبات کی بہترین عکاسی آپ کے کلام میں نظر آتی ہے۔ حُسن و عشق کا بیان کچھ اس طرح سامنے آتا ہے جیسے مومن نے واقعی محبت کی تھی۔ کلام میں جو بے باکی ہے وہ بے باکی اُردو کے کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں۔

نمبر (۱)

تاثیر صبر میں نہ اثر اضطراب میں!
بے چارگی سے جان پڑی کس عذاب میں
بے نامہ منہ سے جھڑتے ہیں بے گریہ آنکھ سے
اجزائے دل کا حال نہ پوچھ اضطراب میں
فکرِ مآل سے ہے وشاہد رہے عزیز
پیری میں موت یاد تھی پیری شباب میں
تم نکلے بہر سیر تو نکلے گا مہر بھی
ہووے گا اجتماع شب ماہ تاب میں
ڈوبی نجوم اشک سے کشتی زمین کی
ماہی کو اضطراب ہوا جوشِ آب میں
اے حشر جلد کر تہ و بالا جہاں کو
یوں کچھ نہ ہو اُمید تو ہے انقلاب میں
قاتل جفا سے باز نہ آیا وفا سے ہم
فتراک ہیں جو سر ہے تو جاں ہے رکاب میں
مومن یہ عالم اس صنم جاں فزا کا ہے
دل لگ گیا جہانِ سراسر خراب میں

نمبر (۲)

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا

بے وفا کہنے کی شکایت ہے
تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا

اس نے کیا جانے کیا کیا لیکر
دل کسی کام کا نہیں ہوتا

کس کو ہے ذوق تلخ کامی لیک
جنگ بِن کچھ مزا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

چارۂ دل سوائے صبر نہیں
سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

کیوں سنے عرض مضطرب مومنؔ
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

نمبر (۳)

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم !

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بیکسی سے ہم

بے زار جان سے جو نہ ہوتے تو مانگتے
شاید شکایتوں پہ تری مدعی سے ہم

اس کو ہیں جا مریں گے مدد اے ہجوم شوق
آج اور زور کرتے ہیں بے طاقتی سے ہم

صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا
لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

بے روئے مثل ابر نہ نکلا غبار دل
کہتے تھے ان کو برق تبسم ہنسی سے ہم

ان ناتوانیوں پہ بھی تھے خار راہ غیر

کیوں کر نکالے جاتے نہ اس کی گلی سے ہم
کیا گل کھلے گا دیکھئے ہے فصلِ گل تو دُور
اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم
مُنہ دیکھتے سے پہلے بھی کس دن وہ صاف تھے
بے وجہ کیوں غبار رکھیں آرسی سے ہم
ہے چھیڑ اختلاط بھی غیروں کے سامنے
ہنسنے کے بدلے روئیں نہ کیوں گدگدی سے ہم
وحشت ہے عشق پردہ نشیں میں دم بکا
مُنہ ڈھانکتے ہیں پردہ چشم پری سے ہم
کیا دل کو لے گیا کوئی بے گانہ آشنا؟
کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم
لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

نمبر (۴)

دل بستگی سی ہے کسی زلف دُوتا کے ساتھ
پالا پڑا ہے ہم کو خدا کس بلا کے ساتھ
یاد ہوائے یار نے کیا کیا نہ گل کھلائے
آئی چمن سے نکہت گل جب صبا کے ساتھ
مانگا کریں گے اب سے دُعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ
یارب وصال یار میں کیونکر ہو زندگی
نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ
اللہ رے سوز آتش غم بعد مرگ بھی

اُٹھتے ہیں میری خاک سے شعلے ہوا کے ساتھ
مرنے کے بعد بھی وہی آوارگی رہی
افسوس جاں گئی نفسِ نارسا کے ساتھ
دستِ جنوں نے میرا گریبان سمجھ لیا
اُلجھا ہے اُن سے شوخ کے بند قبا کے ساتھ
آتے ہی تیرے چل دئے سب ورنہ یاس کا
کیسا ہجوم تھا دلِ حسرت فزا کے ساتھ -

نمبر (۵)

عشق نے یہ کیا خراب ہمیں
کہ ہے اپنے سے اجتناب ہمیں
کیسی حسرت ہے اے سبک روحی
دیکھئے ہے دیدہ حباب ہمیں

کس کی زلفوں کی بو نسیم میں تھی
ہے بلا آج پیچ و تاب ہمیں
اب کوئی کیا کرے علاج افسوس
موت نے بھی دیا جواب ہمیں
اے تپِ ہجر دیکھ مومن کو
ہے حرام آگ کا عذاب ہمیں

شیخ محمد ابراہیم نام اور ذوق تخلص تھا۔ آپ کے والد کا نام شیخ رمضان تھا۔ آپ کی پیدائش ۱۷۸۹ء میں دہلی میں ہوئی۔ آپ کے والد ایک غریب سپاہی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ابتدائی عمر تنگ دستی میں بسر ہوئی۔ ذوق نے حافظ غلام رسول شوق سے عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا۔ شروع میں اپنے استاد سے اصلاح لی پھر شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد ہوئے رفتہ رفتہ آپ کی شہرت کافی بڑھ گئی۔ کاظم حسین بے قرار کی وساطت سے اُنیس سال کی عمر میں دربار اکبر ثانی میں رسائی ہوئی۔ ایک پُر زور قصیدہ پر خاقانی ہند اور ملک الشعرا کے خطاب سے نوازے گئے۔ ولیعہد سراج الدین محمد ظفر کو شاعری سے شوق تھا۔ ذوق نے شاہ ظفر کی غزلوں پر اصلاح کی۔ جب شاہ ظفر بادشاہ ہوئے تو ذوق کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ ظفر کے علاوہ محمد حسین آزاد بھی ذوق کے مشہور شاگرد ہیں۔ ۱۸۵۴ء میں انتقال کیا۔ مرنے کے قبل یہ شعر زبان پر تھا:۔ ؎

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گذر گیا ۔۔۔ کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

ذوق نے قصیدہ گوئی میں اپنا ایک بلند مقام پیدا کیا۔ قصیدوں میں الفاظ کی بندش اور بیان کی رنگینی ہے غزل گوئی میں ذوق کا کوئی امتیازی رنگ نہیں ہے۔ درد اور جرأت کے رنگ کا کافی اثر ہے۔ غزلوں میں روانی اور صفائی ہے محاورات اور ضرب الامثال کو اشعار میں باندھنے

میں کمال رکھتے تھے۔ عارفانہ خیالات اور اخلاقی عناصر غزلوں میں بھرے ہوئے ہیں۔

نمبر(۱)

مزا تھا ہم کو جو بلبل سے دو بدو کرتے
کہ گل تمہارے بہاروں کی آرزو کرتے
مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے
مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے
غرض تھی کیا ترے تیروں کو آب پرکاں سے
مگر زیارت دل کیوں کہ بے وضو کرتے
اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑیں گے
تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے
یقیں ہے صبح قیامت کو بھی صبوحی کش
اٹھیں گے خواب سے ساقی سبو سبو کرتے
نہ رہتی یوسف کنعاں کی خوبی بازار
مقابلہ میں جو ہم تجھ کو روبرو کرتے
چمن بھی دیکھتے گلزار آبرو کی بہار
تمہاری یاد بہاری میں آرزو کرتے
عجیب نہ تھا کہ زمانہ کے انقلاب سے ہم
تیمم آب سے اور خاک سے وضو کرتے
سراغ عمر گذشتہ کا ڈھونڈئیے گر ذوق
تمام عمر گذر جائے جستجو کرتے

نمبر(۲)

رخصت اے زندان جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے

مژدہ خار دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے
بس کر اے سوز دروں بھن جائیں گے دل اور جگر
رحم جوش گریہ پھر چھاتی مری بھر آئے ہے
دم کی ہے سینہ میں آکر ضعف سے یہ گفتگو
دیکھئے لب تک خدا کس طرح سے پہنچائے ہے
نزع میں بھی ذوق کو تیرا ہی بس ہے انتظار
جانب در دیکھ لے ہے جبکہ ہوش آجائے ہے

نمبر (۳)

اے شمع تیری عمر طبعی ہے ایک رات
ہنس کر گذار یا اسے رو کر گذار دے
لے فیض گر ہے چشمہ آب بقا تو کیا
مانگو تو اک قطرہ نہ آئینہ دار دے
اس جبر پہ تو ذوق بشر کا یہ حال ہے
کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے

نمبر (۴)

ابر کیا؟ آنسو بہانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
برق کیا؟ تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
پوچھے ملّا سے جسے کرنا ہو سجدہ سہو کا
سیکھے گر اپنا بھلانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
تیر و پیکان جتنے دل میں تھے دئے ہم نے نکال
اپنے ہاتھوں گھر لٹانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
دیکھ کر قاتل کو بھر لائے خراش دل میں خون
سچ تو یوں ہے مسکرانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

تیغ تو اوچھی پڑی تھی گر پڑے ہم آپ سے
دل کو قاتل کے بڑھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

جب کہا "مرتا ہوں" وہ بولے مرا سر کاٹ کر
جھوٹ کو سچ کر دکھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

واں چلے ابرو یہاں پھیری گلے پر ہم نے تیغ
بات کا ایما بھی پانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

سن کر آمد اُن کی از خود رفتہ ہو جاتے ہیں ہم
پیشوا لینے کو جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

ہم نے پہلے ہی کہا تھا تو کرے گا ہم کو قتل
تیوروں کو تاڑ جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

جو سکھایا اپنی قسمت نے وگرنہ اس کو غیر
کیا سکھائے گا سکھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

کیا ہوا اے ذوق ہیں جوں مردمک ہم روسیاہ
لیکن آنکھوں میں سمانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

مرزا اسد اللہ خان نام اور غالب تخلص۔ پہلے
آپ کا تخلص اسد تھا۔ والد کا نام مرزا عبداللہ بیگ تھا
غالب ۱۷۹۶ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان
شاہ عالم کے عہد میں ایران سے ہندوستان آیا تھا اور آپ
کے اجداد نے شاہی فوج میں ملازمت کی تھی۔ مرزا عبداللہ
بیگ شروع میں والی اودھ کے دربار میں تھے۔ پھر حیدر آباد
آئے اور آخر میں راجہ بختاور سنگھ والئے ریاست الور کے
یہاں ملازم ہوئے۔ الور ہی میں کسی خانہ جنگی میں شہید
ہوئے۔ مرزا نصیر اللہ بیگ نے جو غالب کے چچا تھے۔
پرورش کی۔ دس برس کی عمر میں غالب کے سر سے ان کے
چچا کا بھی سایہ اٹھ گیا۔ حکومت نے جاگیر ضبط کی۔

سترہ سال کی عمر میں شادی ہوئی اور وہ آگرہ سے
دہلی آگئے۔ بہادر شاہ ظفر کے کلام پر اصلاح دینے لگے۔
نجم الدولہ دبیر الملک اور نظام جنگ کے خطاب دربار
سے ملے۔ وظیفہ بھی مقرر ہوا۔ غدر میں پنشن بند ہونے
کی وجہ سے رام پور چلے گئے وہاں بھی آپ کی کافی قدر
ہوئی مگر پھر دہلی آئے اور ۱۸۶۶ء میں انتقال کیا۔
آپ کے کلام میں تخیل کی پرواز ہے انسانی
نفسیات پر غالب کی نظر ہے۔ عالمانہ انداز بیان سے
انہوں نے ہمیشہ دامن بچایا ہے۔ فارسی کی نہایت ہی
انوکھی ترکیبیں استعمال کی ہیں۔ انداز بیان میں جدت بھی

ہے اور استعارات اور تشبیہات میں نیا پن بھی۔ خیالات میں اچھوتا پن ہے۔ بڑی شاعری کی تمام خصوصیتیں غالبؔ کی شاعری میں موجود ہیں۔

نمبر (۱)

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

نمبر (۲)

کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سوئے ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بعد ہے
جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصل شہود و شاہد مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دایم نقاب میں

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغول حق ہوں بندگی بو تراب میں

نمبر (۳)

نیند اسکی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں

تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں
وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیٔ قسمت سے مژگاں ہو گئیں
بس کہ روکا میں نے اور سینہ میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاک گریباں ہو گئیں
واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں
جاں فزا بادہ ہے جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں
ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں
رنج سے خوگر ہو انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں
یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

نمبر (۴۴)

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا
میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں

وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
دل گزرگاہِ خیالِ مئے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سر منزل تقویٰ نہ ہوا
کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجئے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا
مر گیا صدمۂ یک جنبش لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریف دم عیسیٰ نہ ہوا

نمبر(۵)

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا
آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دُود تھا
تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سُود تھا
لیتا ہوں مکتب غم دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بُود تھا
ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا
تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

نمبر(۶)

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائیں گے کیا

حضرت ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرش راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتار وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

ہے اب اس معمورہ میں قحط غم الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا

نمبر (۷)

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے
حوران خلد میں تری صورت اگر ملے

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

ساقی گری کی شرم کرو ورنہ آج ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکش غم پنہاں سے گر ملے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے
اے ساکنان کوچہ دلدار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالب آشفتہ سر ملے

نمبر (۸)

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کے خون کرنیکی فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلک نا انصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تیری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

نمبر (۹)

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی
شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذت فراق
تکلیف پردہ داری زخم جگر گئی

وہ بادہ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھئے بس اب کہ لذّت خواب سحر گئی

اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی

دیکھو تو دلفریبی انداز نقش پا
موج خرام یار بھی کیا گُل کتر گئی

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوہ اہل نظر گئی

نظّارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

فردا ودی کا تفرقہ یکبار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

نمبر (۱۰)

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر مُنہ میں زباں کیوں ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبّت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

غلط ہے جذب دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے

نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو
نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

دیا شنکر کول نام اور نسیم تخلص۔ آپ کے والد کا نام گنگا پرشاد کشمیری تھا ۱۸۱۱ء میں لکھنو میں پیدا ہوئے۔ نسیم کشمیری پنڈت تھے۔ اُردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی اور فارسی شعراء کے کلام کو خوب پڑھا۔ ۲۰ سال کی عمر سے شاعری شروع کی۔ خواجہ آتش سے مشورہ سخن کیا۔ شاہی فوج کی وکالت بسر اوقات کا ذریعہ تھی۔ ۱۸۴۳ء میں انتقال کیا۔ غزلوں کا ایک دیوان اور مثنوی گلزار نسیم یادگار ہیں۔ انہوں نے اپنی مثنوی کی وجہ سے کافی شہرت حاصل کی ہے۔ غزلوں میں آتش کا رنگ جھلکتا ہے۔ مثنوی گلزار نسیم میں تخیل کی رنگینی، الفاظ کی برجستگی۔ خیال کی پختگی اور کہانی کہنے کے انداز نے نسیم کو ایک نہایت ہی بلند مقام دیا ہے۔

گلچین نے وہ پھول جب اُڑایا ۔۔۔ اور غنچہ صبح کھلکھلایا
وہ سبزۂ باغ خواب آرام ۔۔۔ یعنی وہ بکاولی گل اندام
جاگی مرغ سحر کے غل سے ۔۔۔ اُٹھی نکہت سی فرش گل سے
منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی ۔۔۔ پُر آب وہ چشم حوض پائی
دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے ۔۔۔ کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں! کدھر گیا گل ۔۔۔ جھنجلائی کہ کون دے گیا جل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون؟ ۔۔۔ ہے ہے! مجھے خار دے گیا کون
ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے ۔۔۔ بو ہو کے تو پھول اُڑا نہیں ہے
نرگس تو دکھا کدھر گیا گل ۔۔۔ سوسن تو بتا کدھر گیا گل
سنبل مرا تازیانہ لانا ۔۔۔ شمشاد انہیں سولی پر چڑھانا

تھرائیں خواصیں صورت بید — ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید
نرگس نے نگاہ بازیاں کیں — سوسن نے زبان درازیاں کیں
پتا بھی پتے کو جب نہ پایا — کہنے لگیں کیا ہوا خدایا
اپنوں میں سے پھول لے گیا کون — لے گا نہ تھا سبزہ کے سوا کون؟
شبنم کے سوا چرانے والا — اوپر کا تھا کون آنے والا
جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے — جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے
بولی وہ بکاؤلی کہ افسوس! — غفلت سے یہ پھول پر پڑی اوس
آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا — پتلی وہی چشم حوض کا تھا
نام اس کا صبا! نہ لیتی تھی میں — اس گل کو ہوا نہ دیتی تھی میں
گلچیں کا جو ہائے ہاتھ لوٹا — غنچہ کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا
او خار پڑا نہ تیرا جنگل — مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل
او بادِ صبا ہوا نہ بتلا — خوشبو ہی سنگھا پتا نہ بتلا
بلبل تو چہک اگر خبر ہے — گل تو ہی چہک بتا کدھر ہے
لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کہرام — تھی سبزے سے راست مو بہ اندام
انگلی لب جو پہ رکھ کے شمشاد — تھا دم بخود اس کی سن کے فریاد
جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا — جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا
رنگ اس کا غرض لگا بدلنے — گل برگ سے کف لگی وہ ملنے
بدلے کی انگوٹھی ڈھیلی پائی — دست آویز اس کے ہاتھ آئی
خاتم تھی نام کی نشانی — انسان کی دست برد جانی
ہاتھوں کو ملا کہا کہ ہیہات — خاتم بھی بدل گیا ہے بد ذات
جس نے مجھے ہاتھ سے لگایا — وہ ہاتھ لگے کہیں خدایا
عریاں مجھے دیکھ کر گیا ہے — کھال اس کی جو کھینچئے سزا ہے
یہ کہہ کے جنوں میں ہو غضب ناک — خون روئی لباس کو کیا چاک

گل کا سا لہو بھرا گریبان
سبزے کا سا تار تار داماں

دکھلا کے کہا چمن پری کو
اب چین کہاں بکاولی کو

تھی بس کہ غبار سے بھری وہ
آندھی سی اٹھی ہوا ہوئی وہ

کہتی تھی پری کہ اڑ کے جاتی
گلچیں کا کہیں پتہ لگاتی

ہر باغ میں بھولتی پھری وہ
ہر شاخ پہ جھولتی پھری وہ

جس تختے میں مثل باد جاتی
اس رنگ کے گل کی بو نہ پاتی

بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے
پتا کہیں حکم بن ہلا ہے

زندگی اور شاعری پر تبصرہ :-

مرزا سلامت علیؒ دبیرؔ

مرزا سلامت علیؒ نام اور دبیرؔ تخلص۔ آپ کے والد کا نام مرزا غلام حسینؒ تھا۔ آپ کی پیدائش ۱۸۰۳ء میں ہوئی۔ لکھنو میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ مولانا غلام ضامن اور کاظم علیؒ سے فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی اس وقت میر ضمیر لکھنؤ میں اپنے مراثی کی وجہ سے کافی مشہور تھے۔ مرزا دبیرؔ نے میر ضمیر سے فیض تلمذ حاصل کیا۔ جب میر انیس لکھنؤ آئے اس وقت مرثیہ کے میدان میں مرزا دبیر کی شہرت کافی تھی۔ دونوں اساتذہ میں معرکہ آرائی ہوئی اودھ کے نواب نے دونوں استادوں کی کافی عزت افزائی کی ۱۸۷۵ء میں مرزا دبیرؔ کا انتقال ہوا۔

زبان پر کافی قدرت حاصل تھی۔ منظر نگاری جذبات نگاری اور فطرت نگاری خوب کی ہے۔ تین ہزار مراثی اور بہت سارے سلام، نوحے، رباعیات اور قطعات آپ کی یادگار ہیں۔

مرزا دبیر

گرمی کا سماں

تنہا کھڑے ہیں دن میں امام فلک جناب گرمی دکھا رہا ہے قیامت کی آفتاب

لے آگ مرغِ قبلہ نما ہوتے ہیں کباب　　خطِ غبار سے ہے لپی ابر کی سحاب

چھالا ہے آفتاب کا گردوں کے پاؤں میں
خود چھپ رہی ہے دھوپ درختوں کی چھاؤں میں

مٹی خراب چرخ پہ ہے برجِ آب کی　　رنگت ہے برج حوت میں ماہی کباب کی

دریا میں آنکھ بیٹھ گئی ہے حباب کی　　حدت ہے موج موج میں تیرِ شہاب کی

فوارے کو نہ حوض میں گرمی سے کل پڑی
پانی کی بھی زبان دہن سے نکل پڑی

مثلِ تنور گرم تھا پانی میں ہر حباب
ہوتی تھیں سیخ موج پہ مرغابیاں کباب

گلخن صدف تھے دانۂ بریاں درِ خوشِ آب
آتش سے اپنی لعلِ بدخشاں تھا آب آب

یہ دھوپ تھی کہ دانہ کا بچنا محال تھا
دانہ بچا بھی جلنے سے تو خال خال تھا

رباعیات

قطرے کو گہر کی آبرو دیتا ہے
قد سرو کو گل کو رنگ و بو دیتا ہے
بیکار تکلف ہے تصنّع بے سود
عزّت وہی عزّت ہے جو تو دیتا ہے

پروانے کو دھن شمع کو لو تیری ہے
عالم میں ہر اک کو تگ و دو تیری ہے
مصباح و نجوم و آفتاب و مہتاب
جس نور کو دیکھتا ہوں ضو تیری ہے

پیشِ اُمراء طالب زر جھکتے ہیں
سجدے کی طرح مجرے کو سر جھکتے ہیں
سنجیدہ ہیں یہ لوگ ترازو کی طرح
ہے مال سوا جدھر اُدھر جھکتے ہیں

فصل بہاری

مثل نسیم صبح سواری رواں ہوئی | پھولوں کو لیکے فصل بہاری رواں ہوئی
یا فوج فوج قدرت باری رواں ہوئی | زینبؑ پکاری جان ہماری رواں ہوئی

باغوں میں گل زمین کے پردے سے آتے ہیں
اماں کے پھول خاک میں ملنے کو جاتے ہیں

ہر ذرہ غبار ثریا وقار تھا | ہر ذرہ اس کا اختر خوش روزگار تھا
شیرؑ خدا کا شیر ژیاں راہوار تھا | زہراؑ کا آفتاب اسد پر سوار تھا

وہ آس پاس تھے رفقاء اس جناب کے
یا چودھویں کے چاند تھے گرد آفتاب کے

زندگی اور شاعری پر تبصرہ

میر ببر علی انیسؔ

میر ببر علی نام اور انیسؔ تخلص ۱۸۰۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ بزرگوں کا وطن دہلی تھا۔ جد امجد میر ضاحک دہلی سے فیض آباد چلے آئے۔ جب نواب آصف الدولہ نے لکھنو کو صدر مقام بنایا تو آپ کے والد میر خلیق اور دادا میر حسنؔ (مصنف مثنوی سحر البیان) لکھنو آئے۔ ابتدائی تعلیم مولوی حیدر علیؒ صاحب سے حاصل کی۔ شروع میں غزلیں کہیں پھر مرثیہ کی طرف راغب ہوئے ۱۸۵۹ء اور ۱۸۶۰ء میں دو بار پٹنہ تشریف لے گئے۔ ۱۸۷۲ء میں حیدر آباد گئے۔ ۱۸۷۴ء میں لکھنو میں انتقال کیا۔ مرزا دبیرؔ نے تاریخ کہی۔ ع

طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

انیسؔ کو کچھ لوگ اُردو کا شیکسپیئر کہتے ہیں۔ مرثیوں میں خیالات کی پختگی، انسانی جذبات کی عکاسی۔ دلفریب انداز بیان اور محاورات کی دلآویزی سے کچھ عجیب بات پیدا ہو گئی ہے۔ آپ کے کلام میں گہری سنجیدگی ہے کردار نگاری میں بڑی جان ہے۔ میر انیسؔ کا کُل کلام ابھی شائع نہیں ہوا ہے

میر انیسؔ

گرمی کا سماں

وہ لو وہ آفتاب کی حدّت وہ تاب و تب　　کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب

خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب
اڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر ادھر ادھر
آب رواں سے منہ نہ اٹھاتے تھے جانور
خسخانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر
گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

ایک ایک نخل جل رہا تھا صورت چنار
کوسوں کسی شجر میں نہ گل تھے نہ برگ و بار
کانٹا ہوئی تھی پھول کی ہر شاخ باردار
ہنستا تھا کوئی گل نہ مہکتا تھا سبزہ زار
گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے
پتے بھی مثل چہرۂ مدقوق زرد تھے

آہو جو منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
شیر آتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے
گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
گرداب پر تھا شعلہ جوالہ کا گماں
تہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں
پانی تھا آگ گرمی روز حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

چھپنے کو برق چاہتی تھی دامن سحاب
آئینہ فلک کو نہ تھی تاب وتپ کی تاب
کافور صبح ڈھونڈھتا پھرتا تھا آفتاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کو اضطراب
بھڑکی تھی آگ گنبد چرخ اثیر میں
بادل چھپے تھے سب کرۂ زمہریر میں

صبح کا سماں

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور
دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوجِ طور
پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور
اور جا بجا درختوں پر تسبیح خواں طیور
گلشن خجل تھے وادیٔ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

ٹھنڈی ہوائیں سبزۂ صحرا کی وہ لہک
شرمائے جس سے اطلسِ زرکاریٔ فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک
ہر برگِ گل پر قطرۂ شبنم کی وہ جھلک
ہیرے خجل تھے، گوہرِ یکتا نثار تھے
پتّے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

وہ نور اور وہ دشت سہانی میں وہ فضا
درّاج و کبک و تیتر و طاؤس کی صدا
وہ جوشِ گل وہ نالۂ مرغانِ خوش نوا
سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا
پھولوں کے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبد گل فروش تھے

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار
پھولوں پہ جا بجا وہ گہر ہائے آبدار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار
بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار
خواہاں تھے زیبِ گلشنِ زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دئے تھے کٹورے گلاب کے

وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم
کوکو کا شور نالۂ حق سرّہٗ کی دھوم
سبحان ربنا کی صدا تھی علی العموم
جاری تھے جو جوان کی عبادت ایں تھے رسوم
کچھ گل فقط نہ کرتے تھے ربِّ علا کی مدح
ہر خار کو بھی نوکِ زباں تھی خدا کی طرح

رباعیات

گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں
یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں ہیں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

○

دنیا دریا ہے اور ہوس طوفان ہے
مانند حباب ہستئ انسان ہے
لنگر ہے جو دل تو ہر نفس باد مراد
سینۂ کشتی ہے ناخدا ایمان ہے

○

ادبار کا کھٹکا حشم و جاہ میں ہے
جاگو جاگو کہ خوف اس راہ میں ہے
اُٹھو اُٹھو یہ خواب غفلت کب تک
دیکھو دیکھو اجل کمین گاہ میں ہے

○

زندگی اور شاعری پر تبصرہ

امیر احمد امیر مینائی

منشی امیر احمد نام امیرؔ تخلص۔ ۱۸۲۸ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ سلسلۂ نسب حضرت شاہ مینا رحمتہ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ اس وجہ سے آپ کے نام کے ساتھ مینائی لکھا جاتا ہے۔ آپ کے والد کا نام مولوی کرم محمدؒ تھا۔ ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی۔ فارسی اور عربی زبانوں سے گہری واقفیت تھی۔ علم نجوم اور طب سے بھی آپ کو دلچسپی تھی۔ آپ امیرؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ سلطان واجد علی شاہ نے آپ کی شاعری کی شہرت سنی اور اپنے پاس بلوایا اور کافی انعام دیا۔ غدر کے بعد امیرؔ نے بھی ترک وطن کیا۔ رام پور گئے وہاں والئی رام پور نواب یوسف علی خان نے کافی قدر کی نواب یوسف علی خان کے انتقال کے بعد نواب زادہ کلب علی خان نے آپ کو اپنا استاد بنایا۔ ۱۹۰۰ء میں حیدر آباد گئے اس وقت حیدر آباد میں ان کے دوست اور اردو کے مشہور شاعر داغؔ دہلوی موجود تھے۔ اسی سال ایک ماہ نو دن کی علالت کے بعد انتقال فرمایا۔

امیرؔ کا شمار ان کے عہد کے ممتاز شاعروں میں ہوتا ہے۔ ابتدائی کلام پر ناسخؔ کا اثر ہے۔ زبان و بیان پر

قدرت حاصل تھی۔ عشقیہ مضامین کو بہت ہی چابک دستی سے غزلوں میں پیش کرتے تھے۔ جدّت طرازی۔ زبان کی لطافت اور رنگین بیانی ہر جگہ موجود ہے۔ اردو کے دیوان "مراۃ الغیب" اور "صنم خانہ عشق" آپ کی یادگار ہیں۔ آپ نے دو مثنویاں بھی لکھی ہیں۔

امیر مینائی

(۱)

مے پئیں کیا کہ کچھ فضا ہی نہیں
ساقیا باغ میں گھٹا ہی نہیں

خضر کیا جانیں مرگ کی لذت
اس مزے سے وہ آشنا ہی نہیں

کس طرح جائیں اس کی محفل میں
جس کے دل میں ہماری جا ہی نہیں

کیا سنیں گے وہ خلق کی فریاد
کہتے ہیں جو کوئی خدا ہی نہیں

مرنے والوں سے کہتے ہیں وہ امیر
کیا تمہاری کبھی قضا ہی نہیں

(۲)

تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر
سرفروشی کی تمنّا ہے تو سر پیدا کر

کوہ کن کوہ کنی شیوہ عشاق نہیں
ہے جو عاشق دل معشوق میں گھر پیدا کر

رنگ چاہے اگر اس باغ میں آزادی کا

نکہتِ گل کی طرح شوق سفر پیدا کر
قطرۂ اشک ہنے گوہر گوشِ جاناں
آبرو اتنی تو اے دیدۂ تر پیدا کر
آخرت میں عمل نیک ہی کام آئیں گے
پیش ہے تجھ کو سفر زادِ سفر پیدا کر
عشق بازی کا اگر حوصلہ رکھتا ہے امیرؔ
دل جو لوہے کا تو پتھر کا جگر پیدا کر

(۳)

کیا دیر ہے امیرؔ کے عفو گناہ میں
اللہ کیا کمی ہے تیری بارگاہ میں
بے ہوش کوئی بزم خرابات میں نہیں
مشہور یہ خبر ہے غلط خانقاہ میں
خالی شرارتوں سے نہیں ظلمتِ جہاں
لپٹی ہوئی ہے برق کلیم سیاہ میں
پیری میں قد نگوں جو ہوا دانت بھی چلے
بھاگڑ پڑی شکست علم سے سپاہ میں
نکلا نہیں ہے خط ترے عارض پہ حسن نے
کانٹے بچھائے ہیں یہ محبت کی راہ میں
یوسف سے بھی سوا ہے مرے دل کا مرتبہ
ڈوبا ہوا ہے چاہ زنخداں کی چاہ میں
ہے نقش دل پہ صورت توحید اے امیرؔ
ہوں محو ذکرِ اشہد ان لا الہٰ میں

---

(۴)

گلشن میں سرو فوج میں مثلِ نشاں رہے
عالم میں سر بلند رہے ہم جہاں رہے
نیرنگ ان کی شان تجلی کے دیکھئے
اتنے ہوئے عیاں کہ نظر سے نہاں رہے
گلشن میں مجھ سے ہے یہ تقاضائے اضطراب
کھٹکا ہو جس شجر میں وہیں آشیاں رہے
اب دیکھیں کیا دکھائے نشیب و فراز دہر
اب تک تو جس زمین میں ہے آسمان رہے
صیّاد ادھر خلاف اُدھر باغباں اثیر
ہم بارِ خاطرِ قفس و آشیاں رہے

(۵)

کچھ ٹھکانا ہے ناتوانی کا
نہ اُٹھا بوجھ زندگانی کا
مرگ جس کو جہاں میں کہتے ہیں
نام ہے میری زندگانی کا
مثل شبنم ہماری قسمت ہے
ایک دانہ ہے وہ بھی پانی کا
بہرِ نامِ سکندر آئینہ
چشمہ ہے آب زندگانی کا
نہ اُٹھا مفلسی میں دست سوال
ہے یہ احسان ناتوانی کا

منتظر حشر میں ہے دامن تر
مہر محشر کی مہربانی کا

زیست کا اعتبار کیا ہے امیر
آدمی بلبلا ہے پانی کا

نواب مرزا خان داغؔ

نواب مرزا خان نام اور داغؔ تخلص ۱۸۳۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے والد ماجد کا نام نواب شمس الدین احمد خان تھا۔ سات سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ کی والدہ نے ولی عہد سلطنت مرزا محمد سلطان خلف بہادر شاہ ظفر شاہ دہلی سے عقد کر لیا۔ پھر داغؔ بھی قلعہ شاہی میں رہنے لگے۔ تعلیم و تربیت شہزادوں کی طرح ہوئی۔ دس برس کی عمر سے شاعری شروع کی۔ ذوق سے مشورہ سخن کیا۔ ۱۸۵۷ء میں غدر سے آپ کو سخت نقصان پہنچا اور آپ رام پور چلے گئے وہاں نواب یوسف علی خان نے آپ کی کافی قدر کی اور وظیفہ مقرر کر دیا۔ چالیس برس کے بعد آپ حیدر آباد چلے آئے وہاں انہیں ایک ہزار روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا رہا ایک گاؤں بھی جاگیر میں ملا۔ نظام دکن میر محبوب علی خان کے استاد مقرر ہوئے۔ فصیح الملک دبیر الدولہ استاد ناظم یار جنگ کے خطاب ملے ۷ فروری ۱۹۰۵ء میں حیدر آباد ہی میں انتقال ہوا۔

داغؔ غزل کے ایک بڑے استاد تھے اردو غزل میں بھرپور سادگی داغؔ کی وجہ سے صحیح معنوں میں آئی ہے آپ

کی غزلوں میں حسن وعشق کی باتیں شباب اور سرمستی کی حکائتیں نہایت ہی لطیف انداز میں موجود ہیں۔ غزل کی ایک بڑی خوبی سوز و گداز ہے۔ داغ کی غزلوں میں سوز و گداز ہر جگہ ہے۔ آپ کے چار دیوان گلزار داغ۔ آفتاب داغ۔ مہتاب داغ اور یادگار داغ ہیں۔ ایک مثنوی بھی "فریاد داغ" کے نام سے لکھی ہے۔

داغ دہلوی

(۱)

غضب کیا ترے وعدے کا اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا

کسی طرح جو نہ اس بت نے اعتبار کیا
مری وفا نے مجھے خوب شرمسار کیا

یہ دل کو تاب کہاں ہے کہ ہو مآل اندیش
اُنہوں نے وعدہ کیا اس نے اعتبار کیا

نہ اس کے دل سے مٹایا کہ صاف ہو جاتا
صبا نے خاک پریشاں مرا غبار کیا

تری نگاہ کے تصوّر میں ہم نے اے قاتل
لگا لگا کے گلے سے چھُری کو پیار کیا

ہوا ہے کوئی مگر اس کا چاہنے والا
کہ آسمان نے تیرا شیوہ اختیار کیا

نہ پوچھ دل کی حقیقت مگر یہ کہتے ہیں
وہ بے قرار رہے جس نے بے قرار کیا

وہ بات کر جو کبھی آسماں سے ہو نہ سکے
ستم کیا تو بڑا تو نے افتخار کیا

(۲)

تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں
تجھے ہر بہانہ سے ہم دیکھتے ہیں
زمانہ کے کیا کیا ستم دیکھتے ہیں
ہمیں جانتے ہیں جو ہم دیکھتے ہیں
ہمیں چشم بینا دکھاتی ہے سب کچھ
وہ اندھے ہیں جو جام جم دیکھتے ہیں
نہ ایمائے خواہش، نہ اظہار مطلب
مرے منہ کو اہل کرم دیکھتے ہیں
تمہیں داغ کیا کم ہے یہ سرفرازی
کہ شاہِ دکن کے قدم دیکھتے ہیں

(۳)

میں کیا کروں جو بلا سے تو مہرباں ہے اب
وہ دل کہاں ہے اب وہ طبیعت کہاں ہے اب
تم پارسا سہی مگر اتنا تو سوچ لو
کچھ دیکھ ہی لیا تھا جو دل بدگماں ہے اب
دو ظالموں میں لاگ ہوئی میرے واسطے
نامہرباں وہ ہے تو فلک مہرباں ہے اب
سن لو جو ہم بیان کریں پھر کہاں یہ بات
چلتی ہوئی ہمارے دہن میں زباں ہے اب
بیٹھے ہیں ہم بھی گوش بر آواز کہہ تو دو

آنا ہے جس کو آئے یہاں امتحاں ہے اب
کیا کیا ملائے خاک میں انسان چاند سے
سچ پُوچھئے اگر تو زمین آسماں ہے اب
اس کو بھی میری وجہ سے ہیں بدگمانیاں
جو ہم نشیں مرا ہے ترا پاسباں ہے اب

(۴)

اِک چیز ہے اس عالم ہستی میں بشر بھی
دُنیا کا طلب گار بھی دنیا سے حذر بھی
یہ کان تک آئے گی بُری ہو کہ بھلی ہو
رُک جائے گی کیا تیری طرح تیری خبر بھی
بے تاب تری بزم میں دیکھا جسے دیکھا
ہوش اُڑتے ہیں مے اُڑتی ہے اُڑتی ہے خبر بھی
جب جرم محبت کی سزا مل گئی اک بار
تقصیر وہی ہم سے ہوئی بارِ دگر بھی
روندا ہے غضب لشکرِ غم نے مرے دِل کو
ایسی نہیں پامال کوئی راہ گزر بھی
فرماتے ہیں جو سُنتے ہیں جب داغ کے اشعار
اللہ زباں دے تو زباں میں ہو اثر بھی

(۵)

اس جفا پر یہ وفا ہے کہ تمہارا شکوہ
دِل میں رہنے نہ دیا منہ سے نکلنے نہ دیا
شوق نے راہِ محبت میں اُبھارا لیکن
ضعف نے ایک بھی گرتے کو سنبھلنے نہ دیا

کسی صورت نہ بچا عشق کی رسوائی سے
کہ مجھے نام بھی غیرت نے بدلنے نہ دیا
چھین لیتا اسے میں حشر کے دن ضد کر کے
کیا کروں مجھکو فرشتوں نے مچلنے نہ دیا
بزم اغیار میں اس شوق نے عیاری سے
کیا ہی اعجاز کیا داغ کو چلنے نہ دیا

زندگی اور شاعری پر تبصرہ

علی محمّد شاد عظیم آبادی

علی محمّد نام اور شاد تخلص۔ ۱۸۴۶ء میں عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد کا نام سید عباس مرزا تھا۔ ابتدائی تعلیم مختلف مولویوں سے حاصل کی عربی و فارسی کے بعد انگریزی کی تعلیم حاصل کی لیکن زیادہ پڑھ نہ سکے۔ وزیر علی عبرتی اور مولانا تصدّق حسین زخمی کو اپنا کلام دکھایا۔ آپ کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ۱۸۹۱ء میں خان بہادر کا خطاب ملا۔ عرصہ تک آنریری مجسٹریٹ رہے پھر حکومت ہند نے ایک ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ ۱۹۲۹ء میں انتقال کیا۔

شاد عظیم آبادی کا شمار ان شاعروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اردو غزل کو زندگی دی ہے۔ غزل گوئی اور مرثیہ نگاری میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔

غزل میں میر کا رنگ جھلکتا ہے۔ اس کے باوجود آپ کی اپنی انفرادیت نمایاں ہے۔ زبان کی سادگی غضب کی ہے روزمرہ اور عام فہم الفاظ اور محاورات کا استعمال خوب جانتے تھے۔ آپ کے کلام میں اخلاقیات۔ فلسفے اور صوفیانہ خیالات ہر جگہ ہیں۔

"تاریخ صوبہ بہار"۔ "مردم دیدہ"۔ "فکر بلیغ" اور "نغمہ الہام" آپ کی قابل قدر کتابیں ہیں۔

شاد عظیم آبادی

(۱)

تمنّاؤں میں اُلجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

ہوں اُس کوچے کے ہر ذرّہ سے آگاہ
اُدھر سے مدّتوں آیا گیا ہوں

نہیں اُٹھتے قدم کیوں جانب دیر
کسی مسجد میں بہکایا گیا ہوں

دل مضطر سے پُوچھ اے رونق بزم
میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں

ستایا آ کے پہروں آرزو نے
جو دم بھر آپ میں پایا گیا ہوں

نہ تھا میں معتقد اعجازِ مے کا
بڑی مشکل سے منوایا گیا ہوں

لحد میں کیوں نہ جاؤں منہ چھپائے
بھری محفل سے اٹھوایا گیا ہوں

کجا میں اور کجا اے شاد دُنیا
کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

(۲)

نگہ کی برچھیاں جو سہہ سکے سینہ اُسی کا ہے

ہمارا آپ کا جینا نہیں جینا اُسی کا ہے
یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اُسی کا ہے
اُمیدیں جب بڑھیں حد سے طلسمی سانپ ہیں زاہد
جو توڑے یہ طلسم اے دوست گنجینہ اُسی کا ہے
کدورت سے دل اپنا پاک رکھ اے شاد پیری میں
کہ جس کو مُنہ دکھاتا ہے یہ آئینہ اُسی کا ہے

(۳)

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم
اے درد بتا کچھ تو ہی بتا اب تک یہ معماحل نہ ہوا
ہم میں ہے دل بے تاب نہاں یا آپ دل بے تاب ہیں ہم
میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم
اے ضعف باتڑپتے جی بھر کر تو نے تیری مشکیں کس دی ہیں
ہو بند اور آتش پہ ہو چڑھا سیماب بھی وہ سیماب ہیں ہم
ہو جائے بکھیڑا پاک کہیں۔ پاس اپنے بلا لیں بہتر ہے
اب درد جُدائی سے ان کے اے آہ بہت بے تاب ہیں ہم
لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں منزل پہ پہنچتے ہیں دو اک
اے اہل زمانہ قدر کرو' نایاب نہ ہوں کم یاب ہیں ہم
مُرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے
آجاؤ جو تُم کو آنا ہو ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

خواجہ الطاف حسین حالؔی

خواجہ الطاف حسین نام اور حالؔی تخلص۔ ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا۔ جب دس برس کے ہوئے تو والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ بڑے بھائی نے آپ کی مدد کی۔ شادی کے بعد دہلی آ گئے۔ فارسی عربی۔ منطق اور فلسفہ خُوب پڑھا۔ ۱۸۵۶ء میں ملازمت کی لیکن غدر کی وجہ سے ملازمت چھوڑ دی۔ آپ کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ دہلی میں نواب شیفتہ خان کے یہاں رہے۔ شیفتہ کی صحبت میں شعر و سخن کے چرچے خوب ہوئے۔ مرزا غالبؔ کے یہاں بھی جاتے رہے۔ غزلوں پر غالبؔ سے اصلاح لی۔ شیفتہ کے انتقال کے بعد لاہور چلے گئے اور وہاں پنجاب بُک ڈپو میں ملازمت کی۔ چار سال بعد دہلی آئے اور اینگلو عربک اسکول میں پڑھاتے رہے۔ وہی وقت تھا جب ان کی ملاقات سر سید احمد خان سے ہوئی۔ حالؔی نے اپنی نظم "مد و جزر اسلام" لکھی۔ ملازمت چھوڑ کر ادبی خدمات میں مصروف ہو گئے۔ حیدر آباد میں بھی آپ کی کافی قدر ہوئی۔ ۱۹۰۴ء میں حکومت برطانیہ نے شمس العلماء کا خطاب دیا۔ ۱۹۱۴ء میں انتقال ہوا۔

حالؔی نے چالیس برس تک قدیم طرز میں غزلیں کہیں۔ سر سید احمد خان کی صحبت نے ان کے خیالات کو بدل دیا بہت ساری نظمیں بھی لکھی ہیں۔ "مد و جذر اسلام" ۵۹

طویل نظم ہے جس سے حالیؔ کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اُردو نظم میں قومی شاعری کی بنیاد ڈالی۔ آپ نے سوانح عمریاں بھی لکھی ہیں اور تنقیدیں بھی۔ مقدمہ شعر و شاعری سے تو اس کا احساس ہوتا ہے کہ اُردو میں پہلی بار ترقی پسند تنقید کی بنیاد ڈالی گئی ہے۔

حالیؔ پانی پتی

(۱)

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خُوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

ہے دورِ جام اوّلِ شب میں خودی سے دُور
ہوتی ہے آج دیکھیے ہم کو سحر کہاں

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

اک عُمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں

بس ہو چکا بیان گِلِ رنج و راہ کا
خط کا مرے جواب ہے اے نامہ بر کہاں

کون و مکان سے ہے دلِ وحشی کنارہ کش
اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

حالیؔ نشاط و نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح رہے رات بھر کہاں

(۲)

کل مدعی کو آپ پہ کیا کیا گماں رہے
بات اس کی کاٹتے رہے اور ہم زباں رہے

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

یا کھینچ لائے دیر سے رندوں کو اہلِ وعظ
یا آپ بھی ملازمِ پیرِ مغاں رہے

وصلِ مدام سے بھی ہماری بجھی نہ پیاس
ڈوبے ہم آبِ خضر میں اور نیم جان رہے

کل کی خبر غلط ہو تو جھوٹے کا روسیاہ
تم مدعی کے گھر گئے اور میہماں رہے

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

حالیؔ کے بعد کوئی نہ ہمدرد پھر ملا
کچھ راز تھے کہ دل میں ہمارے نہاں رہے

(۳)

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح
لگا دو آگ کوئی آشیاں میں

کہیں انجام آ پہنچا وفا کا
گھلا جاتا ہوں اب کے امتحاں میں

نیا ہے لیجئے جب نام اس کا

بہت وسعت ہے میری داستان میں
دل پر درد سے کچھ کام لوں گا
اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں
بہت جی خوش ہوا حالیؔ سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

(۴)

ہندوستان

اے حصار عاقبت اے کشور ہندوستان
زیب دیتا ہے اگر کہیے تجھے سارا جہاں
اک طرف کھینچی ہے قدرت نے ترے دیوار کوہ
موجزن ہے ایک جانب تیرے بحر بیکراں
چوٹیوں پر سے پہاڑوں کی وہ عالم برف کا
ہے صدا چھایا ہوا جس پر خموشی کا سماں
بحر میں ہوتا ہے اک شور قیامت آشکار
جبکہ اس میں آکے گرتی ہیں ہزاروں ندیاں
خوف باہر کا ہے تجھ کو اور نہ کچھ اندر کی فکر
دست گلچیں نارسا و نخل دولت گل فشاں
تو نے فارغ کر دیا ہے فتح ملک غیر سے
پھر ضرورت کیا کہ کھولیں بے سبب تیر اکشاں
چل رہی ہے امن کی ہر سو ہوائے خوشگوار
ہو نہ اب کھدو خزاں سے رخنہ انداز بہار
اے مقدس آریہ ورت آئی کیا تجھ پر بلا

جس نے بزم یک دلی کو تیری برہم کر دیا
کوچ کر جاتا نہ تجھ سے گر وفاق و اتحاد
کون تھا جو تیری جانب آنکھ اُٹھا کر دیکھتا
تو کہاں اور اہل مغرب کے بھلا حملے کہاں
ہاں مگر نا اتفاقی کی ملی تجھ کو سزا
گر تری اولاد میں ہوتا سلوک اور آشتی
لڑکھڑا جاتے قدم غیروں کے ہنگام دغا
گھاٹیوں میں آکے جب ہوئی فراہم تیری فوج
ہوش کھو دیتی سُم اسپاں ہندی کی صدا
بھاگنا بھی دشمنوں کو واں سے ہو جاتا محال
دیکھتے جب ہر طرف سے آمد سیل بلا!
یا اطاعت کرتے اور لڑنے سے باز آتے وہیں
یا اگر کرتے بہت ہمت تو مر جاتے وہیں
ہند کا حق تھا جو ہوتی مہر و الفت کی زمین
قوم کے ہمدرد ہوتے اس مکاں کے سب مکیں
حیف جس مٹی سے اُگتا چاہئے تھا نخل مہر
جم گیا آب و ہوائے دہر سے واں نخل کیں
سر بسر تختے گل خود رو کے جس جنگل میں تھے
غور سے دیکھا تو پنہاں تھے درندے بھی وہیں
امن قایم تھا طلوع صبح کے آغاز میں
جتنا دن چڑھتا گیا ہوتا گیا عزّت گزیں
دیوتا جو آریہ کے زعم میں فانی نہ تھے
فانیوں کی طرح یاں سکر رہے وہ بالیقین

جنگ و خوں ریزی کے خود آ کر ہوئے وہ راہنما
ورنہ فتنے کا قدم تک یاں نہ آیا تھا کہیں

یک بیک آیا خلل امن و اماں میں ہر طرف
اک تنزّل پڑ گیا ہندوستاں میں ہر طرف

زندگی اور شاعری

سیّد اکبر حسین اکبرؔ

اکبر حسین رضوی نام اور اکبرؔ تخلص۔ ۱۸۴۶ء میں بارہ بنکی ضلع اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام سیّد تفضل حسین تھا۔ عربی اور فارسی کی اچھی تعلیم حاصل کی۔ انگریزی بھی خوب پڑھی۔ ۱۸۶۷ء میں مختارکی کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۶۹ء میں نائب تحصیلدار بنائے گئے۔ پھر ۱۸۷۰ء میں الہ آباد ہائی کورٹ میں مثل خوان ہو گئے ۱۸۷۳ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا اور الہ آباد میں وکالت شروع کی۔ اس کے بعد سرکاری ملازمت مل گئی منصف مقرر ہوئے پھر جج ہوئے۔ آہستہ آہستہ وہ دن بھی آیا جب آپ عدالت خفیفہ کے جج مقرر ہوئے۔ حکومت ہند نے خان بہادر کا خطاب بھی دیا۔ ۱۹۰۳ء میں الہ آباد ہائی کورٹ سے پنشن لے کر ملازمت سے الگ ہو گئے۔ ۱۹۲۱ء میں الہ آباد میں آپ کا انتقال ہوا۔

اکبر الہ آبادی اردو شاعری میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ طنز و مزاح میں نئی راہیں بنائیں اکبر کی شاعری میں ان کی اپنی انفرادیت نمایاں ہے۔ ہندوستان میں آزادی کی تحریک اور مغربی تہذیب کے اثرات سے کافی متاثر ہوئے۔

مغرب کی تقلید کی کافی مخالفت کی اور اس کا مذاق اُڑایا۔ قومی اصلاح کو آپ نے ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ ماضی سے گہرا تعلق پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ان کے طنز و مزاح نے جو کام کیا ہے وہ کام نصیحتوں سے بھی نہیں ہوا ہے سماج کے طرز عمل پر پُر لطف تنقید کی۔ آپ کے یہاں انوکھی تشبیہیں ہیں۔ انگریزی کے بعض الفاظ کا استعمال بھی خوب ہے۔ غزل میں آپ نے روایتی انداز کو نکھارنے کی کوشش کی ہے۔ عاشقانہ رنگ کے اشعار میں جدّت ہے اخلاق اور فلسفہ کو غزل کے قریب کیا۔

اکبر الہ آبادی

(۱)

لطیفہ

ایک بوڑھا نحیف و خستہ و زار
اک ضرورت سے جاتا تھا بازار
ضعف پیری سے خم ہوئی تھی کمر
راہ بے چارہ چلتا تھا جھک کر
چند لڑکوں کو اس پہ آئی ہنسی
قد پہ پھبتی کمان کی سوجھی
کہا اک لڑکے نے یہ اس سے کہ بول
تو نے کتنے کو لی کمان یہ مول
پیر مرد لطیف و دانش مند

ہنس کے کہنے لگا کہ اے فرزند
پہنچو گے میری عمر کو جس دن
مُفت مِل جائے گی تمہیں یہ کمان

(۲)

خوابِ غفلت

بِنائے ملّت بگڑ رہی ہے لبوں پہ ہے جان مر رہے ہیں
مگر طلسمی اثر ہے ایسا کہ خوش ہیں گویا اُبھر رہے ہیں
ادھر ہے قوم ضعیف و مسکیں اُدھر ہیں کچھ مرشدانِ خود بیں
یہ اپنی قسمت کو رو رہی ہے وہ نام پر اپنے مر رہے ہیں
کٹی رگِ اتحادِ ملّت رواں ہوئیں خونِ دل کی موجیں
ہم اس کو سمجھے ہیں آبِ صافی نہا رہے ہیں نکھر رہے ہیں
صدائے اِلحاد اُٹھ رہی ہے خدا کی اب یاد اُٹھ رہی ہے
دِلوں سے فریاد اُٹھ رہی ہے کہ دین سے ہم گذر رہے ہیں
قفس ہے کم ہمتی کا سیمیں پڑے ہیں کچھ دانہائے شیریں
اسی پہ مائل ہے طبعِ شاہیں نہ بال ہیں اب نہ پَر رہے ہیں
اگرچہ یورپ بھی مبتلا ہے وہاں بھی پھیلی یہی بلا ہے
خیال مبیٹر کا بڑھ چلا ہے خدا کا انکار کر رہے ہیں
مگر وہاں کی بنا ہے پنشن رُکا ہے ملحد کا آپریشن
نہیں ہے گم لفظ سالویشن خدا سے اب بھی وہ ڈر رہے ہیں
یہاں بجائے نماز گپ ہے وہاں وہی عزت "لشپ" ہے
یہاں مساجد اُجڑ رہی ہیں وہاں کلیسا سنور رہے ہیں
جنابِ اکبر سے کوئی کہدے کہ لوگ بیٹھے ہیں ہر طرح کے
اس انجمن میں اور ایسی باتیں یہ آپ کیا قہر کر رہے ہیں

قطعہ

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبر
تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں
تو اپنی قوم مچاتی ہے شور و واویلا
جو اعتدال کی کہئے تو وہ ادھر نہ اُدھر
زیادہ حد سے دئے سب نے پاؤں ہیں پھیلا
ادھر یہ ضد ہے کہ لیمنڈ بھی چھو نہیں سکتے
اُدھر یہ دھن ہے کہ ساقی صراحی مئے ملا
ادھر ہے دفتر تدبیر و مصلحت ناپاک
اُدھر ہے وحی ولایت کی ڈاک کا تھیلا
غرض دوگونا عذابست جان مجنون را
بلائے صحبت لیلےٰ و فرقت لیلےٰ

(۴)

یہ موجودہ طریقے راہیٔ مُلکِ عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہونگے
نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی
نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہونگے
نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردے کی یہ پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہونگے
بدل جائے گا اندازِ طبائع دورِ گردوں سے

نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسباب غم ہونگے
نہ پیدا ہوگی خطِ نسخ سے شانِ ادب آگیں
نہ نستعلیق حرف اس طور سے زیب رقم ہونگے
عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملّت سے
نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہونگے
بہت ہونگے مغنی نغمۂ تقلیدِ یورپ کے
مگر بے جوڑ ہونگے اس لئے بے تال و سم ہونگے
ہماری اصطلاحوں سے زبان ناآشنا ہو گی
لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہونگے
بدل جائے گا معیارِ شرافت چشمِ دُنیا میں
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہونگے
کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہو گا نہ غم ہو گا
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہونگے
تمہیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبرؔ
بہت نزدیک ہیں وہ دن کہ تم ہونگے نہ ہم ہونگے

رُباعیات

کھولی ہے زباں خوش بیانی کے لئے
اُٹھا ہے قلم گہر فشانی کے لئے
آیا ہوں میں کوچۂ سخن میں اکبرؔ
نظارہ شاہدِ معانی کے لئے

(۲)

دُنیا کرتی ہے آدمی کو برباد
انکار سے رہتی ہے طبیعت ناشاد
دو ہی چیزیں ہیں بس محافظ دل کی
عقبیٰ کا تصوّر اور اللہ کی یاد

ایک مکالمہ

نئی روشنی کی تعلّی

پھرتے ہیں تذکرہ کالج و اسکول کے ساتھ
خیر مقدم ہے ہمارا ڈنر اور پھول کے ساتھ
معترض گر نہیں دینے کے کبھی بھول کے ساتھ
مستقل چال میں ہم اپنی ہیں معمول کے ساتھ
عمر گذری ہے اسی بزم کی طراری میں
دوسری پشت ہے چندے کی طلبگاری میں

پرانی روشنی کا جواب

بے ضرورت نظر آتا ہے تعلّی کا یہ خیر
معترض کون ہے جب آپ کی نیّت ہے بخیر
اب تو سب آپ کے اپنے ہی ہیں کم رہ گئے غیر
نہ حرم آپ کو بیگانہ سمجھتا ہے نہ دیر

آپ کو لُطف گورنمنٹ سلامت رکھے
مستفید اس سے ہمیں تا بہ قیامت رکھے
غربا بھی ہیں مگر قوم کے اجزا اکثر
غربا ہی سے تعلق میں ہے ان کو مضر
دُور ہے ان سے خود آرائیٔ مغرب کا اثر
بحث ان کی بھی اسی بات پہ ہے ختم مگر
آپ کا دل رہِ مغرب کا اگر سالک ہے
کیجیے چین غریبوں کا خدا مالک ہے
آپ بنگلوں میں ہیں مسرور تو پھر ہم کو کیا
آپ مسجد سے ہوئے دُور تو پھر ہم کو کیا
آپ عہدوں پہ ہیں مغرور تو پھر ہم کو کیا
جاہ ہے آپ کو منظور تو پھر ہم کو کیا

ہم بھی اُبھریں گے کبھی گھر ابھی پستی میں ہیں
آپ دھبوں کی طرح دامنِ ہستی میں ہیں

برج نرائن چکبست

برج نرائن نام اور چکبست تخلص۔ آپ کشمیری برہمن تھے۔ ۱۸۸۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ لکھنو کی ادبی فضا میں انہوں نے اپنے ذوق کو نکھارا۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کالج میں داخل ہوئے۔ ۱۹۰۸ء میں ایل۔ایل بی کی ڈگری حاصل کی اور لکھنو میں وکالت شروع کی۔ ۱۲ فروری ۲۶ میں آپ کا انتقال ہوا۔ محشر لکھنوی نے ان ہی کے مصرعے سے تاریخ کہی۔

ان کے ہی مصرعے سے تاریخ ہے ہمراہ
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

چکبست کی شاعری پر آتش کا گہرا اثر ہے۔ انیس سے بھی کافی متاثر ہوئے تھے۔ آپ کے کلام میں زبان کی بندش اور الفاظ کی چستی قابل داد ہے۔ واقعات کو پیش کرنے کی بڑی صلاحیت تھی۔ سیاسی اور قومی تحریکوں کا بھی آپ کی شاعری پر گہرا اثر ہوا ہے۔ آپ کے کلام کا ایک مجموعہ "صبح وطن" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ آپ نے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔

چکبست لکھنوی (۱)

اگر دردِ محبت سے نہ انسان آشنا ہوتا

نہ کچھ مرنے کا غم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا
بہارِ گل میں دیوانوں کا صحرا میں پرا ہوتا
جدھر اُٹھتی نظر کوسوں تلک جنگل ہرا ہوتا
مے گل رنگ لُٹتی یوں درِ مے خانہ وا ہوتا
نہ پینے کی کمی ہوتی نہ ساقی سے گلا ہوتا
ہزاروں جان دیتے ہیں بُتوں کی بے وفائی پر
اگر ان میں سے کوئی باوفا ہوتا تو کیا ہوتا
رُلایا اہلِ محفل کو نگاہِ یاس نے میری
قیامت تھی جو اک قطرہ اِن آنکھوں سے جُدا ہوتا
خدا کو بھول کر انسان کے دِل کا یہ عالم ہے
یہ آئینہ اگر صورت نما ہوتا تو کیا ہوتا
اگر دم بھر بھی ہٹ جاتی خلش خارِ تمنّا کی
دلِ حسرت طلب کو اپنی ہستی سے گلا ہوتا
ہوس جینے کی ہے یوں عمر کے بیکار کٹنے پر
جو ہم سے زندگی کا حق ادا ہوتا تو کیا ہوتا
یہ مانا بے حجابانہ نگاہیں قہر کرتی ہیں
مگر حسنِ حیا پرور کا عالم دوسرا ہوتا
زباں کے زور پر ہنگامہ آرائی سے کیا حاصل
وطن میں ایک دل ہوتا مگر درد آشنا ہوتا

(۲)

زندگی تلخیٔ ایّام کا افسانہ ہے
زہر بھرنے کے لئے عمر کا پیمانہ ہے
بے حجاب آج تری نرگسِ مستانہ ہے

اب جسے ہوش کا سودا ہے وہ دیوانہ ہے
رُخ ہے ساقی کی طرف ہاتھ میں پیمانہ ہے
وہ نما آج مری لغزش مستانہ ہے
آئی ہے لاش اُٹھانے کو نسیم سحری
چھوٹتا بعد فنا شمع سے پروانہ ہے
عالم یاس میں دریا سے یہ کہتا ہے حباب
غیر سیراب میں خالی مرا پیمانہ ہے
لے چلی بزم سے کس وقت مجھے مرگ شباب
لب تک آیا بھی نہیں ہاتھ میں پیمانہ ہے
یاد احباب گذشتہ پہ فدا رہتا ہے
دل ناشاد بجھی شمع کا پروانہ ہے
دِل ہے مایوس کہ نیت نہیں ساقی کی دُرست
آنکھ کہتی ہے یہ شیشہ ہے وہ پیمانہ ہے
اک طرف جان ہے پیمانِ وفا ایک طرف
امتحاں آج ترا ہمتِ مردانہ ہے

(۳)

نہ کوئی دوست، دشمن ہو شریک درد و غم میرا
سلامت میری گردن پر رہے بار الم میرا
بہار آئی ترقی پر ہے سودا دم بدم میرا
بڑھا جاتا ہے خود زنجیر کی جانب قدم میرا
لکھا یہ داور محشر نے میرے فرد عصیاں پر
یہ وہ بندہ ہے جس پر ناز کرتا ہے کرم میرا
کہا غنچہ نے ہنس کر واہ کیا نیرنگ عالم ہے

وجود گل جسے سمجھے ہیں سب وہ ہے علم میرا
کشاکش ہے امید و یاس کی یہ زندگی کیا ہے
الٰہی ایسی ہستی سے تو اچھا تھا عدم میرا
اگر کون و مکاں اک شعبدہ تھا اس کی قدرت کا
تو اس دنیا میں آخر کس لئے آیا قدم میرا
دل احباب میں گھر ہے شگفتہ رہتی ہے خاطر
یہی جنت ہے میری اور یہی باغ ارم میرا
کھڑی تھیں راستہ روکے ہوئے لاکھوں تمنائیں
شہید یاس ہوں نکلا ہے کس مشکل سے دم میرا
رہی ہے ایک ترک آرزو کی آرزو باقی
اسی پر ختم ہے افسانۂ درد و الم میرا
زباں حال سے یہ لکھنو کی خاک کہتی ہے
مٹایا گردش افلاک نے جاہ و حشم میرا
کیا ہے فاش پردہ کفر و دیں کا اس قدر میں نے
کہ دشمن ہے برہمن اور عدو شیخ حرم میرا

(۴)

آوازۂ قوم

یہ خاک ہند سے پیدا ہیں جوش کے آثار
ہمالیہ سے اٹھے جیسے ابر دریا بار
لہو رگوں میں دکھاتا ہے برق کی رفتار
ہوئی ہیں خاک کے پردہ میں ہڈیاں بیدار
زمیں سے عرش تلک شور "ہوم رول" کا ہے

شباب قوم کا ہے زور "ہوم رول" کا ہے

نگاہ شوق ہے اس رنگ کی تماشائی!
ہے جس سے شیخ و برہمن پہ بے خودی چھائی
ہر ایک گام پر کرتے ہوئے جبیں سائی
چلے ہیں بہر زیارت وفا کے سودائی
وطن کے عشق کا بُت بے نقاب نکلا ہے
نئے اُفق پہ نیا آفتاب نکلا ہے

یہ آرزو ہے کہ مہر و وفا سے کام رہے
وطن کے باغ میں اپنا ہی انتظام رہے
گلوں کی فکر میں گل چیں نہ صبح و شام رہے
نہ کوئی مُرغ خوش الحان اسیر دام رہے
سریر شاہ کا اقبال ہو بہار چمن
رہے چمن کا محافظ یہ تاجدار چمن

ہے آج کل کی ہوائیں وفا کی بربادی
سُنے جو کوئی تو سارا چمن ہے فریادی
قفس میں بند ہیں جو آشیاں کے تھے عادی
اُڑا ہے باغ سے بوہو کے رنگ آزادی
ہوائے شوق میں غنچے بکس نہیں سکتے
ہمارے پھول بھی چاہیں تو ہنس نہیں سکتے

جو آج کل ہے محبت وطن کی عالم گیر
یہی گنہ ہے یہی جرم ہے یہی تقصیر
زباں ہے بند قلم کو پہنائی ہے زنجیر
بیانِ درد کی باقی نہیں کوئی تدبیر

ہے دِل میں درد مگر طاقتِ کلام نہیں
لگے ہیں زخم تڑپنے کا انتظام نہیں

جو اپنے حال پہ بیبسی برستی ہے
یہ نائبان حکومت کی خود پرستی ہے
یہاں سے دُور جو برطانیہ کی بستی ہے
وہاں سُنا ہے محبت کی جنس سستی ہے

جو اس پہ حال وطن آشکار ہو جائے
یہ دیکھتے رہیں بیڑا یہ پار ہو جائے

فدائیاں حکومت نے ہم کو رنج دیئے
مگر جو فرض وفا تھے ادا وہ ہم نے کئے
نثار جاں سے ہوئے داب سلطنت کے لئے
شراب عیش سمجھ کر لہو کے گھونٹ پیئے

ڈگے نہ پاؤں محبت کے نوک خنجر پر
لہو کی مہر ہے اپنی وفا کے محضر پر

جو اپنے دل سے ہے برطانیہ کا دِل راضی
تو کیا کریں گے یہ ہندوستان کے قاضی
نہ کام آئے گی غیروں کی رخنہ اندازی
تمہیں پکار رہی ہے سمجھ کی فیاضی

کبھی کبھی پہ قناعت ہے یُوں نہیں پیتے
پلانے والا پلاتا ہے کیوں نہیں پیتے

رہا ہے رات کی صحبت میں کیا مزا باقی
نگاہِ شوق کہے ہے دورِ نو کی مشتاقی
نئی شراب نیا دور اور نیا ساقی

مئے سرور میں دیر و حرم کی ناچاقی
یہی کسی کا حرم ہو کسی کا دیر رہے
یہ میکدہ رہے آباد خم کی خیر رہے

شراب شوق دوا ہے اس انجمن کے لئے
سرور اس کا ہے اکسیر روح وطن کے لئے
کھنچی ہے خلد میں اس محفل کہن کے لئے
فلک سے اتری ہے یہ شیخ و برہمن کے لئے
رہے گا دور زمانہ میں یادگار اس کا
یہ ہوم رول کا سودا خمار ہے اس کا

اسی کے مست کہیں ہیں حرم پہ چھائے ہوئے
اذاں کے نعرۂ دل کش سے حظ اٹھائے ہوئے
کہیں ہے نغمۂ ناقوس دل لبھائے ہوئے
اسی فضا میں یہ سب راگ ہیں سمائے ہوئے
یہ حکم پیر مغاں کا ہے نشہ مے میں
یہ راگ آ کے ملیں ہوم رول کی لے میں

رقیب کہتے ہیں رنگ وطن نہیں یکساں
بنا ہے قوس قزح خاک ہند کا داماں
جدھر نگاہ اٹھے اس طرف نیا ہے سماں
نہ ایک رنگ طبیعت نہ ایک رنگ زباں
جو ہوم رول پہ یہ چشم شوق شیدا ہو
تمام رنگ ملیں ایک نور پیدا ہو

جو دل سے قوم کے نکلی ہے وہ دعا ہے یہی
تھا جس پہ ناز مسیحا کو وہ صدا ہے یہی
دلوں کو مست جو کرتی ہے وہ ہوا ہے یہی

غریب ہند کے آزار کی دوا ہے یہی
نہ چین آئے گا بے "ہوم رول" پائے ہوئے
فقیر قوم کے بیٹھے ہیں کو لگائے ہوئے

یہ جوش پاک زمانہ دبا نہیں سکتا
رگوں میں خوں کی حرارت مٹا نہیں سکتا
یہ آگ وہ ہے جو پانی بجھا نہیں سکتا
دلوں میں آکے یہ ارمان جا نہیں سکتا
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی "ہوم رول" کے بدلے

زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

(۲)

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر
تو ہے محیط بیکراں میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر
میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خزف تو تو مجھے گوہر شاہوار کر
نغمۂ نوبہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دم نیم سوز کو طائرک بہار کر
باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر
روز حساب جب میرا پیش ہو دفتر عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

(۳)

خرد کے پاس جنوں کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں
ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات، ذوق نظر کے سوا کچھ اور نہیں
گراں بہا ہے فقط تو خودی سے ہی ورنہ
گہر میں آب گہر کے سوا کچھ اور نہیں

رگوں میں گردش خوں ہے اگر تو کیا حاصل
حیاتِ سوزِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں
عروسِ لالہ! مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب
کہ میں نسیمِ سحر کے سوا کچھ اور نہیں
جسے کساد سمجھتے ہیں تاجرانِ فرنگ
وہ شے متاعِ ہنر کے سوا کچھ اور نہیں
بڑا کریم ہے اقبالِ بے نوا لیکن
عطائے شعلہ شرر کے سوا کچھ اور نہیں

(۴)

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں!
حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں!
گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند
میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں
گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں
تو نے یہ کیا غضب کیا! مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

(۵)

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں

یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

(۶)

زمانہ

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرفِ محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ
مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیحِ روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ
ہر ایک سے آشنا ہوں لیکن جدا جدا رسم و راہ میری
کسی کا راکب کسی کا مرکب کسی کو عبرت کا تازیانہ
نہ تھا اگر تو شریکِ محفل قصور میرا ہے یا کہ تیرا؟
مرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر مئے شبانہ
مرے خم و پیچ کو نجومی کی آنکھ پہچانتی نہیں ہے
ہدف سے بیگانہ تیر اس کا نظر نہیں جس کی عارفانہ
شفق نہیں مغربی اُفق پر یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے

طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ
وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ
ہوائیں ان کی فضائیں ان کی سمندر ان کے جہاز ان کے
گرہ بھنور کی کھلے تو کیونکر؟ بھنور ہے تقدیر کا بہانہ
جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالم پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ
ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

(۷)

لینن خدا کے حضور میں

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پایندہ تری ذات
میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے
ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات
محرم نہیں فطرت کے سرودِ ازلی سے
بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات
آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت
میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات
ہم بندِ شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے
تو خالق اعصار و نگارندۂ آیات
اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں

حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات
جب تک میں جیا خیمۂ افلاک کے نیچے
کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات
گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب رُوح کے اندر متلاطم ہوں خیالات
وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود
وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات
مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزّات
یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائیِ تعمیر میں رونق میں صف میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جُوا ہے
سُود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات
یہ علم یہ حکمت یہ تدبّر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و مےخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اُس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دِل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مُروت کو کچل دیتے ہیں آلات

آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر
تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات
میخانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات
چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات

(۸)

فقر

اک فقر سکھاتا ہے صیّاد کو نخچیری
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
اک فقر سے مٹی میں خاصیّت اکسیری
اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری
میراثِ مسلمانی سرمایۂ شبیّری

شوکت علی خان فانیؔ

شوکت علی خان نام اور فانیؔ تخلص۔ بدایوں میں ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے اجداد شاہ عالم کے وقت میں کابل سے ہندوستان آئے تھے۔ فانیؔ نے بارہ برس کی عمر تک عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ بریلی کالج سے بی۔ اے پاس کیا۔ ۱۹۰۸ء میں ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری علی گڈھ سے حاصل کی۔ لکھنو میں وکالت کی پھر حیدر آباد میں ملازمت کی۔

شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ بیس برس کی عمر میں پہلا دیوان مکمل کیا۔ ۱۹۲۶ء میں دوسرا دیوان باقیات فانیؔ کے نام سے شایع ہوا۔

فانیؔ کی شاعری پر میرؔ کا گہرا اثر ہے۔ ان کی اپنی زندگی کی گہری پرچھائیاں شاعری پر ہیں۔ مرزا غالبؔ کی شاعری کا بھی اثر نمایاں ہے۔ لیکن سادگی اور صفائی بیان میں غالبؔ کی سی دشوار پسندی نہیں ہے۔ عربی اور فارسی کے بڑے بڑے الفاظ استعمال نہیں کرتے۔ فانیؔ نے اردو غزل کو ایک مزاج دیا ہے انہوں نے زبان کی صفائی کا ہمیشہ خیال رکھا۔ فانی کی زندگی کی اداسی، مایوسی اور ناکامی کو

ان کی شاعری میں دیکھا جا سکتا ہے۔

فانی

(۱)

تیرا نگاہ شوق کوئی رازداں نہ تھا
آنکھوں کو ورنہ جلوۂ جاناں کہاں نہ تھا
اب تک تری گلی میں یہ رسوائیاں نہ تھیں
اب تک تو اس زمیں پہ کوئی آسماں نہ تھا
ہر شاخ ہر شجر سے نہ تھی بجلیوں کی لاگ
ہر شاخ ہر شجر پہ مرا آشیاں نہ تھا
اللہ رے بے نیازئ آداب التفات
دیکھا جب مجھے تو پائے نظر درمیاں نہ تھا
میرے دل غیور کا حسن طلب تو دیکھ
گویا زباں پہ حرف تمنّا گراں نہ تھا

(۲)

خلق کہتی ہے جسے دل ترے دیوانے کا
ایک گوشہ ہے یہ دنیا اسی ویرانے کا
ایک معمّہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا
مختصر قصّۂ غم یہ ہے کہ دل رکھتا ہوں
راز کونین خلاصہ ہے اس افسانے کا
ہر نفس عمر گذشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

(۳)

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
ساری امیدیں ٹوٹ گئیں دل بیٹھ گیا جی چھوٹ گیا

فصل گل آئی یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آپہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

منزل عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنّا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

(۴)

بہار لائی ہے پیغام انقلاب بہار
سمجھ رہا ہوں میں کلیوں کے مسکرانے کو

یہ شعبدے یہ کرشمے کسے میسر تھے
تری نگاہ نے سکھلا دئے زمانے کو

خیال یار بھی کھویا ہوا سا رہتا ہے
اب ان کی یاد بھی آتی ہے بھول جانے کو

نگاہِ لطف نہ فرما نگاہ ناز کے بعد
جگر میں آگ لگا کر نہ آ بجھانے کو

زمانہ بر سر آزار تھا مگر فانی
تڑپ کے ہم نے بھی تڑپا دیا زمانے کو

(۵)

وہ نظر کامیاب ہو کے رہی
دل کی بستی خراب ہو کے رہی

عشق کا نام کیوں کریں بدنام
زندگی تھی عذاب ہو کے رہی

نگہ شوق کا مآل نہ پوچھ — سر بسر اضطراب ہو کے رہی

چشم ساقی کہ تھی کبھی مخمور — خود ہی آخر شراب ہو کے رہی

تاب نظارہ لا سکا نہ کوئی — بے حجابی حجاب ہو کے رہی

ہم سے فانی نہ چھپ سکا غم دوست

آرزو بے نقاب ہو کے رہی

زندگی اور شاعری
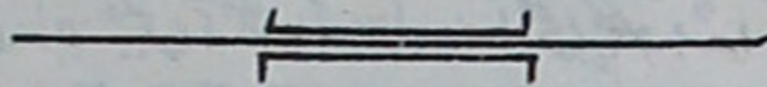
سیّد ریاض احمد ریاضؔ

منشی سیّد ریاض احمد نام ریاضؔ تخلص۔ آپ کے والد واجد کا نام منشی سید طفیل احمد تھا۔ ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم خیر آباد کے مدرسہ میں حاصل کی۔ شاعری کا ذوق بھی وہیں پیدا ہوا۔ لکھنؤ گئے اور وہاں منشی تدبیر الدولہ اسیر کے شاگرد ہوئے۔ پھر امیر مینائی سے مشورہ سخن لیا۔

خیر آباد سے گلکدۂ ریاض کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا اس کے بعد ریاض الاخبار نکالا۔ سرکاری ملازمت بھی کی شاعری میں کافی شہرت حاصل کی۔ نواب رام پور نے انہیں اپنے یہاں بلایا۔ وہ وہاں گئے لیکن زیادہ عرصہ تک نہ رہے گورکھ پور میں پندرہ برس قیام کیا پھر لکھنو چلے آئے۔ آخری عمر میں خیر آباد میں رہے اور راجہ محمود آباد سے وظیفہ ملتا رہا۔

ریاض اردو شاعری میں ایک خاص رنگ کے شاعر ہیں طبیعت کی شوخی کلام میں بھی موجود ہے۔ اندازِ بیان میں چابک دستی ہے۔ طنز کا ایک نہایت ہی دلفریب پہلو نمایاں ہے۔ رندانہ بے تکلفی میں تو ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ صوفیانہ اور اخلاقی رنگ بھی گہرا ہے۔ ۱۹۳۴ء میں انتقال ہوا۔

ریاض خیر آبادی

(۱)

چلی ہے آج ستانے انہیں فغاں میری

ارے ضرور یہ کٹوائے گی زباں میری
تم اپنے بام سے فریاد کی اجازت دو
یہاں سے تو نہیں سنتا ہے آسماں میری
کہے کہے نہ کہے کوئی مجھ کو کیا اس سے
سنیں سنیں نہ سنیں آپ داستاں میری
اٹھاؤں عفو کی لذت بھی لطف عصیاں بھی
مرے کریم یہ تقدیر ہے کہاں میری
ستانے والوں کو کچھ قدر ہو ستانے کی
انہیں ستانے پہ مانے جو آسماں میری
وہ میں ہوں آج زمانے کو ناز ہے جس پر
ریاض دھوم ہے جس کی وہ ہے زباں میری

(۲)

مرے دل کے ارمان مر کر نہ نکلے
جو دل میں چھپے تھے وہ نشتر نہ نکلے
کلیم آئے تو کھل کے جلوہ دکھایا
ہم آئے تو پردہ سے باہر نہ نکلے
ہماری نظر حشر میں شیخ پر تھی
وہ سر پہ لئے حوض کوثر نہ نکلے
رہا ہے جو اس دل میں ہنگامہ آرا
وہی جلوہ آرائے محشر نہ نکلے
نشیمن میں گذرے کئی موسم گل
قفس میں جو ٹوٹے تھے وہ پر نہ نکلے
بٹھایا ریاض اس طرح ضعف دل نے
بہار آئی ہم گھر سے باہر نہ نکلے

اصغر حسین اصغر

اصغر حسین نام اور اصغر تخلص۔ یکم مارچ ۱۸۸۴ء میں گونڈہ میں پیدا ہوئے۔ اصل وطن گورکھ پور تھا۔ ابتدائی تعلیم و تربیت معمولی ہوئی۔ عربی فارسی اور انگریزی پڑھی۔ آپ گونڈہ میں چشمہ کا کاروبار کرتے تھے۔ گونڈہ سے لاہور گئے اور وہاں ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ انڈین پریس الہ آباد سے بھی وابستہ رہے۔

شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ شروع میں منشی خلیل احمد وجد بلگرامی کو اپنا کلام دکھایا۔ آپ کے کلام کے دو مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ نشاطِ رُوح اور "سرود زندگی"۔ آپ کی زبان میں لطافت اور شگفتگی ہے۔ تشبیہات و استعارات کا بھی استعمال خوب جانتے تھے۔ خیال میں اچھوتا پن ہے۔ کلام پر فارسی شاعری کا اثر زیادہ ہے۔ آپ کے یہاں جمالیاتی احساس میں شدّت ہے۔ ۱۹۳۶ء میں انتقال کیا۔

اصغر گونڈوی

(۱)

زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا
رُخ پر تری زُلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

آئے تھے سبھی طرح کے جلوے مرے آگے
میں نے مگر اے دیدۂ حیراں نہیں دیکھا

اس طرح زمانہ کبھی ہوتا نہ پُر آشوب
فتنوں نے ترا گوشۂ داماں نہیں دیکھا

ہر حال میں بس پیشِ نظر ہے وہی صورت
میں نے کبھی روئے شبِ ہجراں نہیں دیکھا

کچھ دعویٔ تمکیں میں ہے معذور بھی زاہد
مستی میں تجھے چاک گریباں نہیں دیکھا

روداد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

کیا کیا ہوا ہنگام جنوں یہ نہیں معلوم
کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا

شائستۂ صحبت کوئی ان میں نہیں اصغرؔ
کافر نہیں دیکھے کہ مسلماں نہیں دیکھا

(۲)

موجوں کا عکس ہے خطِ جامِ شراب میں
یا خوں اچھل رہا ہے رگِ ماہتاب میں

باقی نہ تاب ضبط رہی شیخ و شاب میں
ان کی جھلک بھی تھی مری چشمِ پُر آب میں

کیوں شکوہ سنجِ گردشِ لیل و نہار ہوں
اک تازہ زندگی ہے ہر اک انقلاب میں

وہ موت ہے کہ کہتے ہیں جس کو سکون سب
وہ عینِ زندگی ہے ہر اک اضطراب میں

دوزخ بھی ایک جلوۂ فردوس حسن ہے
جو اس سے بے خبر ہیں وہی ہیں عذاب میں
میں اضطراب شوق کہوں یا جمال دوست
اک برق ہے جو کوند رہی ہے نقاب میں

(۳)

جان نشاط حسن کی دُنیا کہیں جسے
جنّت ہے ایک، خون تمنّا کہیں جسے
اس جلوہ گاہ حسن میں چھایا ہے ہر طرف
ایسا حجاب چشم تماشا کہیں جسے
ہر موج کی وہ شان ہے جام شراب میں
برق فضائے وادی سینا کہیں جسے
میری فغان درد پر اس سرو ناز کو
ایسا سکوت ہے کہ تقاضا کہیں جسے
میں ہوں ازل سے گرم روِ عرصۂ وجود
میرا ہی کچھ غبار ہے دُنیا کہیں جسے
سرمستیوں میں شیشۂ مے کے ہاتھ میں
اتنا اُچھال دیں کہ ثریّا کہیں جسے
اصغر نہ کھولنا کسی حکمت مآب پر
راز حیات ساغر و مینا کہیں جسے

فضل الحسن حسرت

فضل الحسن نام اور حسرت تخلص۔ آپ کے والد کا نام سید اظہر حسن تھا۔ آپ سنہ ۱۸۷۵ء میں موہان میں پیدا ہوئے سنہ ۱۹۰۳ء میں علی گڈھ سے بی-اے پاس کیا۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے سخن گوئی کا شوق تھا۔ شعر و سخن میں امیر اللہ تسنیم لکھنوی کے شاگرد تھے۔ حسرت کے کلام میں مومن کا رنگ جھلکتا ہے۔

حسرت

نے تغزل کے مطالبوں کو پورا کیا اور قدیم اور جدید رنگ دونوں کو اپنایا۔ حسن و عشق کا بیان انسان کی نفسیات اور جذبات کی تصویر کشی اور انداز بیان کی شوخی کلام کی خصوصیات ہیں۔ کلام میں فارسی محاورے اور ترکیبیں بہت زیادہ ہیں۔ اگر غزل صحیح جذبات کی ترجمانی کا نام ہے تو حسرت ایک بڑے غزل گو شاعر تھے۔ آپ نے ۷۵ برس کی عمر میں سنہ ۱۹۵۱ء میں انتقال کیا۔ حسرت کی موت نے ایک بڑا سیاست داں اور ایک بڑا شاعر ہم سے چھین لیا۔

حسرت موہانی

(۱) دل کو خیالِ یار نے مخمور کر دیا ساغر کو رنگِ بادہ نے پُر نور کر دیا

مانوس ہو چلا تھا تسلی سے حالِ دل
پھر تو نے یاد آ کے بدستور کر دیا
گستاخ دستیوں کا نہ تھا مجھ میں حوصلہ
لیکن ہجوم شوق نے مجبور کر دیا
بے تابیوں سے چھپ نہ سکا ماجرائے دل
آخر حضور یار بھی مذکور کر دیا

حسرت بہت ہے مرتبۂ عاشقی بلند
تجھ کو تو مفت لوگوں نے مشہور کر دیا

(۲)

عرض کرم پہ ترک جفا بھی نہ کیجیے
ایسا نہ ہو کہ آپ مِلا بھی نہ کیجیے
اس بے وفا سے مصلحت شوق ہے یہی
اپنی ستم کشی کا گلا بھی نہ کیجیے
منظور ہے جو ترک محبّت ہی آپ کو
ہم پر ہجوم ناز و ادا بھی نہ کیجیے
حسرت یہ کیا ستم ہے کہ اک بُت کے عشق میں
تو چاہتا ہے یاد خُدا بھی نہ کیجیے

(۳)

سب سے چھپتے ہیں چھُپیں مجھ سے تو پردا نہ کریں
سیر گلشن وہ کریں شوق سے تنہا نہ کریں
اب تو آتا ہے یہی جی میں کہ اے محوِ جفا
کچھ بھی ہو جائے مگر تیری تمنّا نہ کریں
میں ہوں مجبور تو مجبور کی پرسش ہے ضرور
وہ مسیحا ہیں تو بیمار کو اچھا نہ کریں
دردِ دل اور نہ بڑھ جائے تسلی سے کہیں
آپ اس کام کا زنہار ارادہ نہ کریں

شکوۂ جورِ تقاضائے کرم عرضِ وفا
تم جو مل جاؤ کہیں ہم کو تو کیا کیا نہ کریں
حال کھل جائے گا بے تابیٔ دل کا حسرت
بار بار آپ انہیں شوق سے دیکھا نہ کریں

(۴)

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے
دلوں کو فکر دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے
خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے
اُمیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

اشعار

سکھا دی ہیں نرالی شوخیاں کچھ لطفِ جاناں نے
مرے دستِ تمنا کی شرارت بڑھتی جاتی ہے

●

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

●

دوپہر کی دھوپ میں مجھ کو بُلانے کے لئے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

علی سکندر جگرؔ مرادآبادی

علی سکندر نام اور جگرؔ تخلص۔ ۱۸۹۰ء میں مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام علی نظر تھا جو شاعر بھی تھے۔ جگرؔ صاحب نے شروع میں اپنے والد سے اصلاح لی۔ پھر داغؔ دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ منشی امیر اللہ تسلیمؔ لکھنوی کو بھی اپنی غزلیں دکھائی ہیں۔ جگرؔ کی شاعری پر داغؔ کا گہرا رنگ ہے۔ داغؔ کی شاعری سے جگرؔ کو شوخی اور سادگی ملی ہے۔ آپ کے کلام کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں (۱) داغِ جگر (۲) شعلۂ طور (۳) آتشِ گل شعلۂ طور میں اصغرؔ گونڈوی کا رنگ نمایاں ہے۔ جگرؔ صاحب کو اصغرؔ صاحب سے بے پناہ عقیدت ہے۔ شعلۂ طور کی غزلوں میں جو بے خودی رنگینی اور سرمستی ملتی ہے۔ اس میں جگرؔ کی شاعرانہ عظمت موجود ہے حسن و عشق کے بیان میں بہت سادگی ہے۔ تصوف اور اخلاقی عناصر بھی آپ کی شاعری میں موجود ہیں۔

جگرؔ مرادآبادی

(۱)

دل دھڑکتے ہی پھر گئی وہ نظر — لب تک آئی نہ تھی کہ بات گئی
ان کے بہلائے بھی نہ دل بہلا — رائگاں سعیِ التفات گئی

مرگِ عاشق تو کچھ نہیں لیکن اک مسیحا نفس کی بات گئی

(۲)

میری ہستی ہے غبارِ کوئے دوست
مجھ سے پیدا ہر سکوں ہر اضطراب
عشق کیا ہے؟ پرتوِ حسنِ تمام
شوق کیا ہے؟ حسن کا عکسِ شباب
مختصر ہے شرحِ ہستی اے جگر
زندگی ہے خواب اصل تعبیرِ خواب

(۳)

یہ حسن، یہ شوخی، یہ کرشمہ یہ ادائیں
دنیا نظر آئی مجھے تو کیا نظر آیا
اک سرخوشیِ عشق ہے، اک بے خودیِ شوق
آنکھوں کو خدا جانے، میری کیا نظر آیا
قربان تری شانِ عنایت کے دل و جاں
اس کم نگہی پر مجھے کیا کیا نظر آیا
ہر رنگ، ترے رنگ میں ڈوبا ہوا نکلا
ہر نقش ترا نقشِ کفِ پا نظر آیا

اشعار

تم مجھ سے چھوٹ کر رہے سب کی نگاہ میں
میں تم سے چھوٹ کر کسی قابل نہیں رہا

●

تری یاد کی اُف یہ سرمستیاں

کوئی جیسے پی کر شراب آ گیا

●

قفس کی یاد میں پھر جی یہ چاہتا ہے جگر
لگا کے آگ نکل جاؤں آشیانے کو

●

آنسوؤں کی کمی نہیں لیکن
کچھ سبب تھا کہ آنکھ تر نہ ہوئی

●

نظر صیّاد کی کیا؟ برق بھی ہو تو لرز اُٹھے
ابھی آیا نہیں تنکوں کو جانِ آشیاں ہونا

●

کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں اے واعظ
میں ساغر اپنا اُٹھاتا ہوں تو کتاب اُٹھا
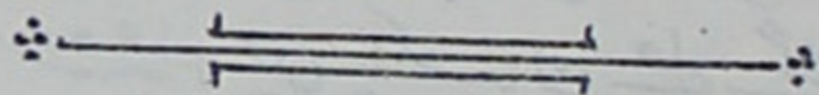
شبیر حسین جوشؔ

شبیر حسین نام اور جوشؔ تخلص ہے ۱۸۹۴ء میں ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔ فقیر محمد خان گویا آپ کے پر دادا تھے۔ بچپن ہی میں آپ کے والد کا انتقال ہو گیا اس لئے زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ پھر بھی اردو، فارسی اور انگریزی کا اچھا مذاق رکھتے ہیں۔ کچھ عرصہ تک دار الترجمہ عثمانیہ حیدر آباد سے وابستہ رہے۔ شعبۂ تالیف و ترجمہ میں دس برس تک کام کرتے رہے پھر دہلی سے رسالہ کلیم جاری کیا "نیا ادب" کے بھی مدیر رہے لکھنؤ سے بمبئی چلے گئے اور فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے۔ بہت سارے فلمی گیت لکھے۔ فلمی دنیا میں ان کی طبیعت نہیں لگی۔ دہلی میں ملازمت مل گئی۔ "آج کل" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے ۱۹۵۵ء میں پاکستان چلے گئے۔

اقبالؔ کے بعد جوشؔ نے اردو نظم کو زندگی بخشی ہے۔ جوشؔ کی شاعری نے نئی نسل کو متاثر کیا ہے۔ انہوں نے انقلابی اور رومانی نظمیں زیادہ لکھی ہیں اس لئے وہ شاعر انقلاب اور شاعر شباب کے نام سے مشہور ہیں۔
جوشؔ صاحب کو زبان پر پوری قدرت حاصل ہے۔

سنبل و سلاسل۔ شعلہ و شبنم۔ نقش و نگار۔ جنوں و حکمت

فکر و نشاط، شاعر کی راتیں، عرش و فرش، حرف و حکایات، آیات و نغمات، رامش و رنگ، سرود و خروش آپ کی بلند پایہ تصانیف ہیں۔

جوش ملیح آبادی

شکستِ زنداں کا جواب

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آکر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا، آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
آنکھوں میں گدائی کی سُرخی بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں
کیا ان کو خبر تھی زیر و زبر رکھتے تھے جو روحِ ملت کو
ابلیں گے زمیں سے مارِ سیہ، برسیں گی فلک سے شمشیریں
کیا ان کو خبر تھی سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں
کیا ان کو خبر تھی ہونٹوں پہ جو قفل لگایا کرتے تھے
اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

---

(۲)

چاند کے انتظار میں

کس نے وعدہ کیا ہے آنے کا
حسن دیکھو غریب خانے کا

رُوح کو آئینہ دکھاتے ہیں
در و دیوار مسکراتے ہیں

آج گھر گھر بنا ہے پہلی بار
دل میں ہے خوش سلیقگی بیدار

غرق ہے رُوح خوش جمالی میں
تنظم ہے طبع لا اُبالی میں

جمع ساماں ہے عیش و عشرت کا
خوف دل میں فریب قسمت کا

سوز قلب، کلیم آنکھوں میں
اشک اُمید و بیم آنکھوں میں

چشم بر راہ شوق کے مارے
چاند کے انتظار میں تارے

رات بھیگی، شگفتہ ہار ہوا
رنگ کلیوں میں آشکار ہوا

ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں میں مچلی
ہلکی ہلکی مہک چنبیلی کی

وعدہ جنجال بن گیا جی کا
رنگِ اُمید ہو چلا پھیکا

اک جہاں چشم تر میں گرد ہوا
دل وہ دھڑکا کہ رنگ زرد ہوا

دفعتہً اک چمک سی دوڑ گئی
بام و در پر جھلک سی دوڑ گئی

دل میں چمکی اُمید کی بجلی
انگلیاں اور ہوگئیں ٹھنڈی

الاماں شوق دید کی یورش
بڑھ گئی اور خون کی گردش

اپنی حد وفا ہوئی محسوس
ان کی آواز یا ہوئی محسوس

چھاگئی بام و در پہ رعنائی
دل میں لی ولولوں نے انگڑائی

جل اٹھی شمع دل کی مجلس میں
صبح گویا ہوئی بنارس میں

فرطِ شادی سے بوکھلا سا گیا
لڑکھڑانی زباں، قدم کانپا
یہ رہا سلسلہ وہ آہوں کا
رشتہ سمٹا مری نگاہوں کا
آئے وہ اشک تھم گئے بارے
چاند نکلا سبک ہوئے تارے

(۳)

اِدھر بھی بادِ صبا آ بہار کی سوگند
شمیم طرۂ گیسوئے یار کی سوگند
سکھا جمال کو ایفائے عہد کا دستور
جفائے طولِ شب انتظار کی سوگند
ٹھہر ٹھہر کے سُنا داستان عشوہ و ناز
نزاکت دل اُمیدوار کی سوگند
سنا دے جوشؔ کو بھی نغمہ ہائے بُلبل و نہار
خروشِ آمدِ فصلِ بہار کی سوگند

(۴)

محفلِ عشق میں وہ نازشِ دوراں آیا
اے گدا خواب سے بیدار کہ سلطان آیا
اے کلی نازسے کھل، بادۂ سرجوش اُبل
کہ نگارِ چمن و شاہدِ مشتاق آیا
خاطرِ جمع سے ہشیار کہ برہم ہوئی زلف
کشتئ دل سے خبردار کہ طوفان آیا
کج کلاہی کا سرو برگ مبارک اے جوشؔ
لے پیامِ شکنِ طرۂ جاناں آیا

رباعیات

(۱)

دریا کا شب مہ میں جھمکنا ہے ہے
رخسارۂ ساقی کا جھلکنا ہے ہے
ساحل پہ دہکتے ہوئے پیمانے سے
پگھلے ہوئے سونے کا چھلکنا ہے ہے

(۲)

پھر صبر کی تلخ مے پیے لیتے ہیں
پھر اپنا گریباں سیے لیتے ہیں
کل ملنے کا وعدہ ہے تو خیر او ظالم
ہم اور بھی ایک دن جیے لیتے ہیں

(۳)

دامن کو ہمیشہ نم کیا کرتا ہے
دریا تری آنکھوں سے بہا کرتا ہے
یک مشت اجل کو جان دینا بہتر
مرتا ہے با قساط یہ کیا کرتا ہے
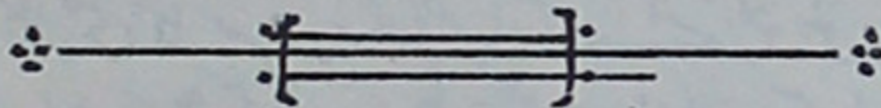
رگھوپتی سہائے فراقؔ

رگھوپتی سہائے نام اور فراقؔ تخلص۔ گورکھپور کے رہنے والے ہیں۔ اردو کے مایہ ناز شاعر ہیں۔ اردو شاعری میں فراق ایک نئی زبان لے کر آئے ہیں۔ ان کی آواز اور ان کا طرزِ احساس بالکل نیا ہے۔ فراقؔ صاحب نے نئے الفاظ دئے ہیں اور معمولی الفاظ میں نئی باتیں کہی ہیں۔ نئی شاعری کو ان سے ایک خاص قسم کی زندگی حاصل ہوئی ہے جنسی زندگی کو شعور میں جگہ دی ہے۔ سینکڑوں ایسے اشعار ہیں جو بہت سے شاعروں کے دیوانوں پہ بھاری ہیں۔ آپ کی غزلوں میں انسانی نفسیات کی گہری پرچھائیاں ہیں۔ لہجہ میں غضب کا نکھار اور تخیل میں بے پناہ حسن ہے۔ جمالیاتی احساس میں بہت رچاؤ ہے سوز و گداز اور چاشنی ہر جگہ موجود ہے۔ وصل، فراق، ہجر اور معشوق کے متعلق ایک نئے انداز سے سوچتے ہیں۔ فراقؔ کی شاعری میں جو گھلاوٹ اور نغمگی ہے وہ اب تک کسی شاعر کو حاصل نہیں ہو سکی ہے لفظوں میں سیاسی رنگ گہرا ہے۔ ترقی پسند شاعری کی بنیاد جن شاعروں نے مضبوط کی ہے اُن میں فراقؔ کا نام بہت ہی اہم ہے۔ ترقی پسند تنقید میں بھی انہوں نے قابل قدر اضافے کئے ہیں

فراقؔ گورکھپوری

(۱)

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنّا بھی نہیں

لیکن اس ترکِ محبّت کا بھروسا بھی نہیں
ایک مدّت سے تمہی یاد بھی آئی نہ ہمیں!
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں
مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
ہائے اب مجھ سے تجھے رنجش بیجا بھی نہیں
آج غفلت بھی ان آنکھوں میں ہے پہلے سے سوا
اور دل ہجر نصیب آج شکیبا بھی نہیں

(۲)

ماتھے پہ ترے صبحِ چمن کھیل رہی ہے
آنکھوں میں محبت کی کرن کھیل رہی ہے
ناگن کوئی بل کھاتی ہے پیہم کہ ہوا سے
وہ زلفِ شکن زیرِ شکن کھیل رہی ہے
پیراہنِ خوش وضع سے آتی ہے لپٹ سی
ملبوس میں خوشبوئے بدن کھیل رہی ہے
اس پیکرِ رنگین میں ہے شوخیِ پنہاں
بجلی نہ دامانِ چمن کھیل رہی ہے
باتوں میں فراق اس کی معطر ہے سماعت
ہر لفظ میں خوشبوئے دہن کھیل رہی ہے

اشعار

جینے والے جی لیں گے اب نہ ملوگے اچھی بات

●

یہ دکھ، یہ رنج، یہ آزردہ حالیاں تیری

جو چُوم چُوم نہ لوں سب اُداسیاں تیری

●

فریبِ عہدِ محبّت کی سادگی کی قسم
وہ جھوٹ بول کہ سچ کو بھی پیار آ جائے

●

تُم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو!
تُمکو دیکھوں کہ تُم سے بات کروں
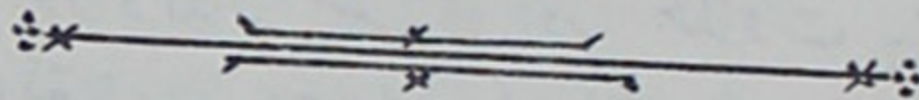
روشؔ صدیقی

شاہد عزیز صدیقی نام ہے اور روشؔ تخلص۔ آپ ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے۔ جوالا پور ضلع سہارن پور کے رہنے والے ہیں۔ اردو اور فارسی کی تعلیم گھر پر پائی۔

ان کی غزلوں میں سوز و گداز، شیرینی اور حلاوت ہے۔ نظموں میں رومان اور انقلاب دونوں کی باتیں ہیں۔ سیاسی تخیل میں زیادہ بلندی نہیں ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس سے ایک خاص قسم کی تڑپ کا احساس ہوتا ہے۔

نمونۂ کلام

(۱)

وہ سادگیٔ ناز، وہ معصوم نگاہی
اعجاز ہے من جملہ آیاتِ الٰہی

کیا جرمِ محبت سے بھی انکار ہے تجھ کو
معلوم ہے اے دل تری ناکردہ گناہی

کچھ میری خموشی بھی تھی غمازِ محبت
اس پر ترے اندازِ تغافل کی گواہی

وہ خود بھی تو ہیں قافلۂ شوق میں شامل
تنہا تو نہیں قافلۂ شوق کا راہی

تعمیرِ محبت کو یہ آغاز مبارک
ہر عالم محسوس ہے بے تابِ تباہی

اک جلوۂ یزداں، ترے عارض کی تجلی
خود پردۂ کعبہ تری زلفوں کی سیاہی

فرصت ہے کسے شکوہ گرداب الم کی
دل ہے تو ہزاروں ابھی طوفان تباہی

خاک درِ محبوب سے نسبت ہے روشؔ کو
قدموں سے ذرا دور رہے افسر شاہی

(۲)

تذکرہ رہتا ہے دل سے سحر و شام ان کا
لب تک آجائے نہ بھولے سے کہیں نام ان کا

زندگی کیوں ہمہ تن گوش ہوئی جاتی ہے
کبھی آیا ہے جواب آئے گا پیغام ان کا

حسرت دید رہی خلوت دل میں روپوش
اور دیدار خدائی رہا عام ان کا

دور پہنچا مرا قصہ، کہ بڑی حسرت سے
شکوہ کرتی تھی فلک سے شفق شام ان کا

ہم کو شکوہ تو نہیں شیخ و برہمن سے مگر
بے غرض کفر ہی ان کا ہے نہ اسلام کا ان کا

جام و مینا سے الجھتے ہیں جو میخوار روشؔ
مسلکِ بادہ پرستی ہے بہت خام ان کا

علامہ جمیل مظہری

حضرت جمیل مظہری کا نام سید کاظم علی ہے۔ سارن بہار کے رہنے والے ہیں۔ بچپن سے شاعری کا شوق تھا۔ اردو فارسی اور انگریزی کا گہرا مطالعہ ہے۔ پٹنہ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ آپ کے کلام کے دو مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ ابتدائی تعلیم کلکتہ میں حاصل کی۔ حکومت بہار کے پبلسٹی آفیسر بھی رہ چکے ہیں۔ اقبال کے بعد جن شاعروں نے فطرت نگاری کی اور ملکی زندگی کو موضوع سخن بنایا۔ ان میں جوش ملیح آبادی کے ساتھ علامہ جمیل مظہری کا بھی نام آتا ہے۔ جمیل صاحب کو زبان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ غزلوں میں سوز و گداز ہے۔ نظموں میں زندگی سے پیار کرنے کی تعلیم ہے۔ آپ کے کلام میں جہاں سوز و گداز ہے وہاں فلسفہ اور تفکر بھی ہے۔ وہ ایک مفکر شاعر ہیں۔ تصوف کا رنگ بھی غزلوں میں جھلکتا ہے۔

نمونۂ کلام

موسم بہار

ملاح اگر بنے ہو پیارے — سمجھو موسم کے بھی اشارے
پتوار نہ توڑ دیں تمہاری — حالات کے تند و تیز دھارے

سن سن کے یہ اختیار کا راگ | ہمت مجبوروں کی بڑھی ہے
گو تم نے بنا بنا کے قانون | زنجیر نئی نئی گڑھی ہے
بیدار عمل ہیں ان کے جذبات | ہر چند ابھی تلے نہیں ہیں
طوفان ہمک رہا ہے ان میں | پانی کے یہ بلبلے نہیں ہیں
لنگر بھاری سہی تمہارا | کشتی لیکن اچھل رہی ہے
موجیں نہ ہوں بے قرار کیوں کر | ندی کروٹ بدل رہی ہے
بہکی بہکی ہوئیں ہوائیں | ٹکڑے بادل کے لا رہی ہیں
موجوں کے گلے میں باہیں ڈالے | طوفاں کے گیت گا رہی ہیں
یہ کس نے بتا دیا ہے تم کو | بادل میں بہار کی نشانی
ان گھٹاؤں پر نہ پھولو | برسے گا انہیں سے لال پانی
موسم آنکھیں دکھا رہا ہے | منظر تیور بدل رہے ہیں
چھوٹے چھوٹے حباب بھی آج | منہ سے طوفان اگل رہے ہیں
موجیں کف در دہاں ہیں تم پر | فطرت چیں بر جبیں ہیں تم سے
کشتی والے مچاتے ہیں غل | کشتی چلتی نہیں ہے تم سے

اب خیر اسی میں ہے کہ آؤ
کشتی کو ڈبو کے بھاگ جاؤ

غزل

کہے گا خود نقشِ پائے ہمت، قدم قدم پر مرا فسانہ
میں وہ مسافر ہوں جس کے پیچھے ادب سے چلتا رہا زمانہ
جہاں خدا کے صفات پر بھی نظر ہو بندوں کی ناقدانہ
اک ایسی دنیا میں کیا بچے گا، کسی کا پندار حاکمانہ

کلاہ داروں سے کوئی کہہ دے کہ ہے یہ تاریخ کی عدالت
کھڑی ہوئی ہے وہ ہاتھ باندھے یہاں نبوت بھی مجرمانہ
یہ کیسی محفل ہے جس میں ساقی لہو پیالوں میں نبٹ رہا ہے
مجھے بھی تھوڑی سی تشنگی دے کہ توڑ دوں یہ شراب خانہ
تجلیاں گرتھ رہی ہیں سورج سیاہیاں بُن رہی ہیں راتیں
خدا و ابلیس کی شراکت میں چل رہا ہے یہ کارخانہ
یہ کس کے ذہن رسا کے سائے میں پل رہے ہیں نئے تصوّر
یہ کس کے جوش عمل کے سانچے میں ڈھل رہا ہے نیا زمانہ
یہ کس کے افسون ادعا نے طلسم صدیوں کے توڑ ڈالے
اُجڑ گئیں ساری بارگاہیں بدل گیا سارا کارخانہ
تصوّرِ رنگ و بو بھی بدلا۔ طبیعتِ آب و گل بھی بدلی
فسانے بننے لگے حقیقت، حقیقتیں بن گئیں فسانہ
جو راکھ کے ڈھیر رہ گئے ہیں وہ اب اُٹھیں گرد راہ بن کر
جرس کی آواز کہہ رہی ہے کہ قافلہ ہو چکا روانہ
بُجھے چراغوں میں روشنی ہے۔ نشیلی آنکھوں کی نیند اُڑی ہے
جمیل کی بانسری نے چھیڑا ہے شام سے صبح کا ترانہ

زندگی اور شاعری

فیض احمد فیض

فیض احمد فیض اُردو کے ایک بہت ہی اہم شاعر ہیں۔ ان کی شاعری ایک موڑ بن کر سامنے آتی ہے۔ فیض ایک نئی غنائیت لے کر آئے۔ ان کی غنائیت نئے ڈھنگ سے خوب سج کر آئی ہے۔ فیض نے شروع میں غزلیں کہیں پھر نظموں کی طرف دھیان دیا۔ ان کی غزلوں میں نفاست، رچاؤ اور شگفتگی ہے وہ نغمگی ہے جو تغزل کی نغمگی سے مختلف ہوتے ہوئے بھی بڑے سوز وگداز اور بڑی سرمستی کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے نفاست شگفتگی اور چاشنی کے ساتھ فیض نے قدیم اور روایتی علامات کو برقرار رکھا ہے۔ ان کی غزلوں کی زبان صاف ہے لطافت ہر جگہ موجود ہے۔

(شکیل الرحمان فیض کی شاعری مطبوعہ۔ شاہراہِ دہلی)

فیض احمد فیض

(۱)

تم آئے ہو نہ شب انتظار گذری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گذری ہے

جنوں میں جتنی بھی گذری بکار گذری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گذری ہے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے
چمن پہ غارت گلچیں سے جانے کیا گذری
قفس سے آج صبا بے قرار گذری ہے

(۲)

وصل کی شب تھی تو کس درجہ سبک گذری تھی
ہجر کی شب ہے تو کیا سخت گراں ٹھہری ہے
آتے آتے یونہی دم بھر کو رُکی ہوگی بہار
جاتے جاتے یوں ہی پل بھر کو خزاں ٹھہری ہے
ہم نے جو طرز فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرز بیاں ٹھہری ہے

(۳)

صبحِ آزادی

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شب سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غم دل
جواں لہو کی پُر اسرار شاہراہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے

دیارِ حسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
پکارتی رہیں باہیں، بدن بلاتے رہے
بہت عزیز تھی لیکن رُخِ سحر کی لگن

بہت قریں تھا حسینانِ نور کا دامن
سبک سبک تھی تمنا دبی دبی تھی تھکن
سنا ہے ہو بھی چکا ہے فراقِ ظلمت و نور
سنا ہے ہو بھی چکا ہے وصالِ منزل و گام
بدل چکا ہے بہت اہلِ درد کا دستور
نشاطِ وصل حلال و عذابِ ہجر حرام

جگر کی آگ نظر کی اُمنگ دل کی جلن ـــــــــ
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا کدھر کو گئی
ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں

ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

اسرار الحق مجاز

اسرار الحق نام اور مجاز تخلص تھا۔ آپ کی پیدائش پہلی جنگ عظیم کے زمانہ میں ہوئی۔ اردو، فارسی اور انگریزی کی اچھی تعلیم حاصل کی۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو گئے۔ پھر حکومت بمبئی کے محکمۂ اطلاعات میں ملازم رہے۔ وہاں سے لکھنو چلے آئے اور رسالۂ "نیا ادب" کے ادارہ میں شامل ہو گئے۔ ہارڈنگ لائبریری میں بھی کچھ عرصہ تک رہے۔ مجاز اُن شاعروں میں ہیں جنہوں نے ترقی پسند تحریک کی بنیاد مضبوط کی ہے۔ مجاز کی غزلوں پر شروع میں فانی کا اثر رہا۔ انہوں نے روایتی انداز کو نئی زندگی سے قریب کیا۔ غزلوں میں شوخی ہے۔ جذبات نگاری بھی ہے۔ انقلابی شاعری میں بھی مجاز کی رومانیت موجود ہے۔ سنہ ۱۹۵۵ء میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ "آہنگ سازِ نو" اور "شب تاب" آپ کے کلام کے قابل قدر مجموعے ہیں۔

مجاز لکھنوی

آوارہ

شہر کی رات اور میں ناشاد ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں

غیر کی بستی ہے کب تک دربدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تخیل جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے کون سمجھے جی کا حال
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملّا کا عمامہ جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اُٹھی چوٹ سی دل پر پڑی
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر دہکی ہوئی شمشیر سی
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

راستے میں رُک کے دم لوں یہ مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہم نوا مل جائے یہ قسمت نہیں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ مے خانے میں چل
پھر کسی شہناز لالہ رُخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

منتظر ہے ایک طوفانِ بلا میرے لئے
اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وا میرے لئے
پر مصیبت ہے مرا عہدِ وفا میرے لئے
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں ٹھانی ہے کہ اب عہدِ وفا بھی توڑ دوں
ان کو پا سکتا ہوں میں یہ آسرا بھی توڑ دوں
ہاں مناسب ہے یہ زنجیر ہوا بھی توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں رعنائیاں
ہر قدم پہ عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

دل میں اک شعلہ بھڑک اٹھا ہے آخر کیا کروں
میرا پیمانہ چھلک اٹھا ہے آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اٹھا ہے آخر کیا کروں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں

ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و سامان پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطان پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں!

معینؔ احسن جذبیؔ

معین احسن جذبی ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ شروع میں صادق جھانسوی اور حامد شاہ جہاں پوری سے مشورہ سخن کیا۔ آگرہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ فانی کی شاعری کا آپ کی شاعری پر گہرا اثر ہے۔ جذبی صاحب کا اپنا لہجہ اور اپنا خاص انداز بیان ہے۔ جدید شاعروں میں اپنا ایک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ آپ کے کلام کا ایک مجموعہ "فروزاں" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

"جذبی کی غزلوں میں غم کے تصوّر کو بڑی وسعتیں ملی ہیں۔ ان کا انفرادی غم اجتماعی غم کے ساتھ مل کر حیات کو سمجھنے کی نئی ممکنات پیدا کرتا ہے۔ ان کی غزلوں میں سوز و گداز ہے اور نغمگی ہے۔ ان کا شیریں تغزل جدید شاعری میں ایک مقام رکھے گا وہ اپنے تجربوں کے لئے خوب صورت ہیئت کی تلاش میں بڑی محنت کرتے ہیں۔"

(شکیل الرحمان۔ "جذبی کا شعور"۔ مطبوعہ "شاعر" بمبئی)

(۱)

مشعل تھے جو بحرِ ظلمت میں وہ ماہ و اختر ٹوٹ گئے
اور لطف یہ ہے اے طوفانو! کشتی کے بھی لنگر ٹوٹ گئے

اک یاس بھرے دل پر نہ ہوئی تاثیر تمہاری نظروں کی
اک موم کے بے حس ٹکڑے پر یہ نازک خنجر ٹوٹ گئے

یا اشکوں کا رونا تھا مجھ کو یا اکثر روتا رہتا ہوں

یا ایک بھی گوہر پاس نہ تھا یا لاکھوں گوہر لوٹ گئے
تو اور غم اُلفت جذبی مجھ کو تو یقین آئے نہ کبھی
جس قلب پہ ٹوٹے ہوں پتھر اس قلب میں نشتر ٹوٹ گئے

(۲)

موت

اپنی سوئی ہوئی دنیا کو جگا لوں تو چلوں
اپنے غم خانے میں ایک دھوم مچا لوں تو چلوں
اور اک جام مئے تلخ چڑھا لوں تو چلوں
ابھی چلتا ہوں ذرا خود کو سنبھالوں تو چلوں

جانے کب پی تھی ابھی تک ہے مئے غم کا خمار
دھندلا دھندلا نظر آتا ہے جہانِ بیدار
آندھیاں چلتی ہیں دنیا ہوئی جاتی ہے غبار
آنکھ تو مل لوں ذرا ہوش میں آ لوں تو چلوں

وہ میرا سحر وہ اعجاز کہاں ہے لانا
میری کھوئی ہوئی آواز کہاں ہے لانا
میرا ٹوٹا ہوا وہ ساز کہاں ہے لانا
اک ذرا گیت بھی اس ساز پہ گا لوں تو چلوں

میں تھکا ہارا تھا اتنے میں جو آئے یاد دل
کسی متوالے نے چپکے سے بڑھا دی بوتل
اُف وہ رنگین پُر اسرار خیالوں کے محل
ایسے دو چار محل اور بنا لوں تو چلوں

مجھ سے کچھ کہنے کو آئی ہے مرے دل کی جلن
کیا کیا میں نے نہیں جس کا زمانے میں چلن
آنسوؤ! تم نے تو بیکار بھگویا دامن
اپنے بھیگے ہوئے دامن کو سکھا لوں تو چلوں

میری آنکھوں میں ابھی تک ہے محبت کا غرور
میری ہونٹوں پہ ابھی تک ہے صداقت کا غرور
میرے ماتھے پہ ابھی تک ہے شرافت کا غرور
ایسے وہموں سے بھی اب خود کو نکالوں تو چلوں

کیفی اعظمی

کیفی اعظمی کے یہاں رومان کی باتیں ہیں اور انقلاب کی بھی۔ ان کی نظموں میں ہندوستان کے آنسو اور ہندوستان کی مسکراہٹیں ہیں۔ پرانے اور نئے آقاؤں کے احسانات آزادی اور مساوات کے سچے عناصر ہیں۔ ان نظموں کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ کیفی اعظمی اپنے ماحول کا صحیح اور مکمل جائزہ لیتے ہوئے کبھی گھبراتے نہیں۔ کیفی اعظمی کی رومانی نظموں میں انسانی جذبات اور نفسیات کی سچی عکاسی ہے۔

نمونۂ کلام

تُم

شگفتگی کا، لطافت کا شاہکار ہو تُم
فقط بہار نہیں حاصل بہار ہو تم
جو ایک پھول میں ہے قید وہ گلستاں ہو
جو اک کلی میں ہے پنہاں وہ لالہ زار ہو تُم
حلاوتوں کی تمنا، ملاحتوں کی مُراد
غرور کلیوں کا پھولوں کا انکسار ہو تم
جسے ترنگ میں فطرت نے گنگنایا ہے
وہ بھیرویں ہو، وہ دیپک ہو وہ ملہار ہو تم

تمہارے جسم میں خوابیدہ ہیں ہزاروں راگ
وہ نغمہ جس کو زمانہ نہ چھیڑ سکا وہ ستار ہو تم
جسے اٹھا نہ سکی جستجو وہ موتی ہو
جسے نہ گوندھ سکی آرزو وہ ہار ہو تم
جسے نہ بوجھ سکا عشق وہ پہیلی ہو
جسے سمجھ نہ سکا پیار بھی وہ پیار ہو تم
خدا کرے کسی دامن میں جذب ہو نہ سکیں
یہ میرے اشک حسیں جن سے آشکار ہو تم

علی سردار جعفری

علی سردار جعفری ۱۹۱۳ء میں بلرام پور ضلع گونڈہ میں
پیدا ہوئے۔ لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی اور ایم۔ اے کی ڈگری لی
انہوں نے ۔ مارکسی نظریۂ
حیات کی ترجمانی جس طرح کی ہے۔ اس طرح جدید شاعروں
میں کسی نے بھی نہیں کی۔

سردار جعفری نے آزاد شاعری کے مطالبوں کو پورا
کیا ہے۔ ان کے کلام میں ماحول کی تصویریں صاف نظر آتی ہیں
انہوں نے زندگی کی تصویر کشی کی ہے۔ زندگی پر سخت تنقیدیں
کی ہیں اور زندگی کی راہنمائی کی ہے۔ ترقی پسند روایتیں سردار
جعفری کے سہارے آگے بڑھی ہیں۔ جدید تر شاعروں پر سردار
کی شاعری کا کافی اثر ہے۔ ان کے یہاں شاعرانہ نزاکتیں
بھی ہیں اور نئی تشبیہیں اور استعارے بھی وہ جدید ادب کے
ایک بے باک شاعر اور نقاد ہیں۔

"پرواز"۔ "نئی دنیا کو سلام"۔ "خون کی لکیر"۔ "پتھر کی دیوار"
آپ کی وہ قابل قدر کتابیں ہیں۔ جن سے زندگی کے ارتقا
کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور سردار جعفری کی شاعری کو
بھی۔ "ترقی پسند ادب" میں آپ کی تنقید کا رنگ دیکھا جا سکتا
ہے ؏

علی سردار جعفری

نیند

(اپنے بچّے کی پہلی سالگرہ پر)

رات خوب صورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی ——؟
روز رات کو یوں ہی
نیند میری آنکھوں سے
بے وفائی کرتی ہے
مجھ کو چھوڑ کر تنہا
جیل سے نکلتی ہے
بمبئی کی بستی میں
میرے گھر کا دروازہ
جا کے کھٹکھٹاتی ہے
ایک ننھے بچّے کی
انکھڑیوں کے بچپن میں
میٹھے میٹھے خوابوں کا
شہد گھول دیتی ہے
نرم نرم گالوں کو
جھک کے پیار کرتی ہے۔

ایک حسین پری بن کر
لوریاں سناتی ہے
یا لنا ہلاتی ہے۔

(۲)

حُسنِ ناتمام

کس قدر شاداب و دلکش ہے وہ حسُنِ ناتمام
جس کی فطرت غنچگی۔ دوشیزگی ہے جس کا نام
جس طرح پچھلے پہر کا صاف و پاکیزہ اُفق
جس کے سینے سے ابھی پہلی کرن پھوٹی نہیں
جس طرح اک کھلنے والی ناشگفتہ سی کلی
جس کے دامن تک ابھی بادِ سحر پہنچی نہیں
برگِ گُل پر جس طرح شبنم کی اک ننھی سی بوند
جو شعاعِ مہرِ تاباں سے ابھی اُلجھی نہیں
جس طرح ساغر میں صہبا جیسے مینا میں شراب
جو ابھی مچلی نہیں۔ چھلکی نہیں۔ اُبلی نہیں
جس طرح اک شوخ بجلی بادلوں کی آڑ میں
جو ابھی تڑپی نہیں، لپکی نہیں۔ ٹوٹی نہیں
جس طرح گیسوئے پیچاں جیسے زُلف خم بہ خم
جو ابھی کھل کر ہوا کے دوش پر مہکی نہیں

جس طرح دریا میں موتی جیسے موجوں میں صدف
چشم انساں نے ابھی حسن کی چمک دیکھی نہیں
جیسے ذہنِ پاکِ شاعر میں تخیل کی پری
جو ابھی تک شیشۂ الفاظ میں اتری نہیں
اب تلک یوں بھی اچھوتا ہے وہ حسن نا تمام
جس کی فطرت غنچگی دوشیزگی ہے جس کا نام

ساحر لدھیانوی

غزل

تنگ آچکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم

مایوسیٔ مآلِ محبت نہ پوچھئے
اپنوں سے پیش آتے ہیں بیگانگی سے ہم

لو آج ہم نے توڑ دیا رشتۂ اُمید
لو اب کبھی گلہ نہ کریں گے کسی سے ہم

اُبھریں گے ایک بار ابھی دل کے ولولے
گو دب گئے ہیں بارِ غمِ زندگی سے ہم

گر زندگی میں مل گئے پھر اتفاق سے
پوچھیں گے اپنا حال تری بے بسی سے ہم

اللہ رے فریبِ مشیت کہ آج تک
دُنیا کے ظلم سہتے رہے خامشی سے ہم

---

(۲)

فن کار

میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے
آج اُن گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں
آج دکان پہ نیلام اُٹھے گا ان کا
تو نے جن گیتوں پہ رکھی تھی محبت کی اساس
آج چاندی کے ترازو میں تلے گی ہر چیز
میرے افکار، میری شاعری، میرا احساس
جو تری ذات سے منسوب تھے ان گیتوں کو
مفلسی، جنس بنانے پہ اُتر آئی ہے
بھوک تیرے رخِ رنگین کے فسانوں کے عوض
چند اشیائے ضرورت کی تمنائی ہے
دیکھ اس عرصہ گہِ محنت و سرمایہ میں
میرے نغمے بھی میرے پاس نہیں رہ سکتے
تیرے جلوے کسی زردار کی میراث سہی
تیرے خاکے بھی میرے پاس نہیں رہ سکتے
آج ان گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں
میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے

احمد ندیم قاسمی

قطعات

(۱)

کوئی فسانہ سُنا سیم رنگ پریوں کا
ابھی خدا کے لئے نغمۂ حیات نہ چھیڑ
مرا شباب، مری شاعری، مرے رومان
یہ راز ہیں، مرے رازوں کی کوئی بات نہ چھیڑ

(۲)

ڈھول بجتے ہیں، دنا دن کی صدا آتی ہے
فصل کٹتی ہے، لچکتی ہے بچھی جاتی ہے
نوجواں گاتے ہیں جب سانولے محبوب کا گیت
ایک دوشیزہ ٹھٹک جاتی ہے، شرماتی ہے

(۳)

جوگ

شکستہ مقبروں میں، ٹوٹتی راتوں کو اک لڑکی
لئے ہاتھوں میں بربط، جوگ میں کچھ گنگناتی ہے
کہا کرتے ہیں چرواہے کہ جب رکتے ہیں گیت اس کے
تو ایک تازہ لحد سے چیخ کی آواز آتی ہے

(۴)

آمدِ شباب

مہندی رچا کے پاؤں میں، یہ ناچنے کا شوق
زلفوں میں شانہ پھیر کے، یہ بھاگنے کی دُھن
شاید کسی کی مست جوانی کے ہیں نشان
یہ صبح صبح سونے کی شب جاگنے کی دُھن

رُباعیاتِ محرومؔ

(۱)

انکارِ گُناہ بھی کیئے جاتا ہوں
تکرارِ گناہ بھی کیئے جاتا ہوں
حاصل ہو ثواب مفت اس لالچ میں
اقرارِ گناہ بھی کیئے جاتا ہوں

(۲)

تسکین ممکن نہیں قناعت کے بغیر
پھر بھی مشکل ہے زیست دولت کے بغیر
محنت سے جو ہاتھ آئے دولت ہے وہی
ہے مالِ حرام، اگر ہے محنت کے بغیر

(۳)

نفرت رندی سے گو تجھے ہے محروم

میکش ہیں کئی تجھ سے زیادہ معصوم

گذری ہے عمر مدرسے میں تیری

میخانہ کے اسرار تجھے کیا معلوم

قطعات

اختر انصاری

(۱)

چاندنی راتیں

ہمیشہ جاگتے ہی جاگتے سحر کر دی
کبھی ہنسا۔ کبھی آہیں بھریں، کبھی رویا
بنا کے چاند کو اپنا گواہ کہتا ہوں
میں آج تک شبِ مہتاب میں نہیں سویا

(۲)

یادِ ایّام

ایک یہ دن ہیں کہ ساری ساری رات
جاگتا رہتا ہوں نیند آتی نہیں
اور اک وہ وقت تھا یادش بخیر
جب مری بیداریاں بھی خواب تھیں

(۳)

اخفائے حقیقت

جو پوچھتا ہے کوئی "سرخ کیوں ہیں آج آنکھیں؟"
تو آنکھیں مل کے میں کہتا ہوں "رات سو نہ سکا"
ہزار چاہوں مگر یہ نہ کہہ سکوں گا کبھی
کہ "رات رونے کی خواہش تھی اور رو نہ سکا"

سوالات

۱۔ شاعری کیا ہے؟ اُردو شاعری کا ایک مختصر جائزہ لیجئے۔
۲۔ شاعری اور زندگی کا کیا تعلق ہے؟ بحث کیجئے۔
۳۔ سودا پر ایک مختصر مضمون لکھئے اور یہ بتائیے کہ سودا کے کلام کی خصوصیتیں کیا ہیں؟
۴۔ درد کی غزلوں میں زندگی کا بہت سارا حسن اور سوز و گداز جمع ہو گیا ہے، کیا آپ اس خیال سے متفق ہیں؟
۵۔ سحر البیان وہ تصویر ہے جس میں میر حسن کے زمانہ کے رسم و رواج کی جھلکیاں موجود ہیں، مفصل لکھئے۔
۶۔ "میر تقی میر کی شاعری میں ان کی زندگی کی تصویریں جھلکتی ہیں۔ بحث کیجئے۔
۷۔ سیّد انشاء کی غزلوں میں خیالات کم ہیں اور الفاظ کی شان و شوکت زیادہ۔ کیا آپ اس سے متفق ہیں؟
۸۔ نظیر اکبر آبادی ایک عوامی شاعر تھے۔ "عوامی شاعر" سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
۹۔ ناسخ کے کلام کی خصوصیتیں کیا کیا ہیں؟
۱۰۔ آتش نے اردو غزل کو عظمت بخشی ہے۔ بحث کیجئے۔

۱۱- مومن کی غزلوں میں سوز و گداز اور درد کی چاشنی ہے - اس خیال سے آپ کہاں تک متفق ہیں؟

۱۲- غزل گوئی میں ذوق کا کوئی امتیازی رنگ نہیں ہے۔ بحث کیجئے۔

۱۳- غالب کی زندگی پر ایک نوٹ لکھیے

۱۴- غالب کی شاعری میں شاعری کی تمام خصوصیتیں موجود ہیں - بحث کیجئے۔

۱۵- نسیم کی مثنوی میں تخیّل کی رنگینی کے ساتھ کہانی کہنے کا ایک پیارا انداز بھی ہے۔

۱۶- انیس اور دبیر دونوں نے گرمی کے سماں پر جو کچھ لکھا ہے اسے سلیس اردو میں پیش کیجئے اور دونوں نظموں کا مقابلہ کیجئے ؛